شعبان المعظم ۱۴۳۸ھ
مئی ۲۰۱۷ء

# ماہنامہ میثاق لاہور

یکے از مطبوعات

## تنظیمِ اسلامی

بانی: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

- اِصلاحِ معاشرہ کا انقلابی تصوّر (مسلسل)
  بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ
- مسلمانوں کی اجتماعی قوت کے دو اصول
  حضرت مولانا مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ


داعیٔ رجوع الی القرآن، بانیٔ تنظیم اسلامی

محترم ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

کے شہرۂ آفاق دورۂ ترجمہ قرآن پر مشتمل

بیانُ القرآن

ترجمہ و مختصر تفسیر

حصہ اول سُورۃ الفاتحہ و سُورۃ البقرۃ مع تعارفِ قرآن
صفحات: 360، قیمت 475 روپے

حصہ دوم سُورۃ آلِ عمران تا سُورۃ المائدہ
صفحات 321، قیمت 425 روپے

حصہ سوم سُورۃ الانعام تا سُورۃ التوبہ
صفحات 331، قیمت 425 روپے

حصہ چہارم سورۃ یُونس تا سُورۃ الکہف
صفحات 394، قیمت 485 روپے

حصہ پنجم سُورۃُ مریم تا سُورۃُ السّجدۃ
صفحات 480، قیمت 575 روپے

حصہ ششم سُورۃُ الاحزاب تا سُورۃُ الحجرات
صفحات 484، قیمت 590 روپے

حصہ ہفتم سُورۃُ قٓ تا سُورۃُ النّاس
صفحات 560، قیمت 650 روپے

یکے از مطبوعات: انجمن خُدّام القرآن خیبر پختونخوا، پشاور

شائع کردہ: مکتبہ خُدّام القرآن لاہور

K-36، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون 3-35869501 (042)

وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ ۙ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۡ (المائدۃ:۷)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل اور اس کے میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی!

# ماہنامہ میثاق لاہور

اجرائے ثانی

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ


جلد : 66

شمارہ : 5

شعبان المعظم 1438ھ

مئی 2017ء

فی شمارہ -/30



مُدیر
حافظ عاکف سعید

نائب مُدیر
حافظ خالد محمود خضر



سالانہ زرِ تعاون

| | |
|---|---|
| اندرون ملک | 300 روپے |
| بھارت و بنگلہ دیش | 900 روپے |
| ایشیا' یورپ' افریقہ وغیرہ | 1200 روپے |
| امریکہ' کینیڈا' آسٹریلیا وغیرہ | 1500 روپے |

ترسیلِ زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مکتبہ خدام القرآن لاہور

مقام اشاعت: 36۔ کے ماڈل ٹاؤن' لاہور 54700' فون: 3-35869501

فیکس: 35834000' ای میل: maktaba@tanzeem.org

ای میل برائے ادارتی امور: publications@tanzeem.org

ویب سائٹ ایڈریس: www.tanzeem.org

مرکزی دفتر تنظیم اسلامی: 67۔ علامہ اقبال روڈ' گڑھی شاہو' لاہور

فون: 36316638 - 36366638

پبلشر: ناظم مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

طابع: رشید احمد چودھری مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ




## مشمولات


عرضِ احوال — 5

جمعیت العلمائے ہند سے نسبت قائم کیجیے' لیکن......! — ایوب بیگ مرزا

بیانُ القُرآن — 11

سورۃ العنکبوت (آیات ۱۴ تا ۴۴) — ڈاکٹر اسرار احمدؒ

تعمیرِ سیرت و کردار — 29

اصلاحِ معاشرہ کا انقلابی تصور (۲) — ڈاکٹر اسرار احمدؒ

اعتصامش کن...... — 51

مسلمانوں کی اجتماعی قوت کے دو اصول: تقویٰ اور باہمی اتفاق — حضرت مولانا مفتی محمد شفیعؒ

تذکّر و تدبّر — 61

قرآن مجید: انسانیت کی ضرورت — حافظ محمد مشتاق ربانی

خطوط و نکات — 65

اہلِ ایمان کے لیے خلود فی النار — پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

تذکیر و موعظت — 67

الاقتصاد فِی العِبادۃ — پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

سبق پھر پڑھ...... — 72

اسلام کا معاشی نظام — شجاع الدین شیخ

یادِ رفتگاں — 84

حاجی عبدالواحد صاحبؒ کی یادداشتیں (۱۳) — پروفیسر حافظ قاسم رضوان

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# جمعیت العلمائے ہند سے نسبت قائم کیجیے‘ لیکن.....!

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی اگرچہ ہندو‘ مسلم‘ سکھ نے مشترکہ طور پر انگریز کے خلاف لڑی تھی‘ لیکن انگریز کو اچھی طرح معلوم تھا کہ اس جنگ میں مرکزی‘ کلیدی اور اہم ترین کردار مسلمانانِ ہند کا ہے۔ بعض مؤرخین کے مطابق تو شکست کی ایک وجہ سکھوں کی غداری بھی تھی۔ بہرحال ناکامی کا سارا بوجھ ہندوستان کے مسلمانوں کو اٹھانا پڑا اور انگریز نے مسلمانوں کو ٹارگٹ کیا۔ ہندو کا عمومی رویہ چونکہ ظاہر کر رہا تھا کہ ہندوستان پر انگریز کے قبضہ سے اسے کوئی خاص تشویش نہ تھی‘ پہلے مسلمانوں کی رعایا تھے‘ اب انگریز ان کا حکمران تھا‘ چنانچہ ایک طرف ہندو بے دلی سے لڑی ہوئی آزادی کی جنگ سے ہونے والے نقصان کی تلافی چاہتا تھا تو دوسری طرف انگریز اپنی divide and rule کی پالیسی کو پوری شدت سے نافذ کر کے ہندوستان میں اپنے اقتدار کو مستحکم کرنے بلکہ دائمی بنانے کی فکر میں تھا۔ چونکہ اس جنگ میں مسلمانوں کی نمائندگی مذہبی رہنماؤں یعنی علماء کرام نے کی تھی‘ لہٰذا انہیں تختہ دار پر کھینچا گیا‘ جیلوں میں ڈالا گیا اور بدترین تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ انگریز کی ہند میں آمد سے پہلے ہندوستان معلوم دنیا میں سونے کی چڑیا کے نام سے موسوم تھا۔ ظاہر ہے جب حکمران مسلمان تھا تو معاشی فوائد بھی سب سے زیادہ مسلمان ہی کو حاصل تھے۔ انگریز نے عام مسلمان کے معاشی مفادات پر ہر ممکن ضرب لگائی اور ہندو نے انگریز کی اس پالیسی کا بھرپور فائدہ اٹھایا۔

انگریز نے ہندوستان میں اپنا نظامِ تعلیم متعارف کروایا‘ سرکاری نوکریوں کے دروازے صرف ان لوگوں کے لیے کھلے رکھے گئے جو ان کے نظام کے مطابق تعلیم یافتہ ہوتے تھے۔ مسلمان اس نظامِ تعلیم کا پہلے انکاری پھر متذبذب رہا۔ مسلمانوں کے مذہبی رہنماؤں یعنی علماء کرام نے جب وقت کی جابر حکومت سے تصادم کی صورت میں مسلمانوں کے مفادات کو شدید خطرے میں محسوس کیا تو انہوں نے اصحابِ کہف کی سنت کو اپناتے ہوئے سیاسی معاملات سے لاتعلق ہو کر خود کو مدارس میں محصور کر لیا اور مسلمانوں کے بچوں کو اسلامی تعلیمات دینے کے لیے خود کو وقف کر دیا۔



انگریز نے یہ حکمت عملی اپنائی کہ ان لوگوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیا اور حکومتی سطح پر کوئی مداخلت نہ ہوئی‘ البتہ نوکریاں انگریزی تعلیم کے حصول سے منسلک رہیں۔ اس سے مسلمانوں کی معاشی حالت کمزور سے کمزور تر ہوتی چلی گئی‘ لیکن ان مدارس کی وجہ سے مسلمانوں کا اسلامی تعلیمات‘ بنیادی عقائد اور دینی شعائر سے تعلق قائم رہا۔

سرسید احمد خان نے مسلمانوں کو دنیوی تعلیم کی طرف راغب کیا۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے دینی اور دنیوی تعلیم کے درمیان ایک پُل قائم کرنے کی کامیاب کوشش کی۔ علی گڑھ میں ایک تعلیمی ادارہ قائم کیا جو بعد میں یونیورسٹی کا درجہ حاصل کر گیا۔ لیکن انیسویں صدی میں ہندوستان کے علمائے کرام نے مسلمان کا مذہب سے تعلق قائم رکھنے بلکہ اسے مضبوط تر کرنے کے لیے جو جہاد کیا‘ وہ بے مثل تھا۔ دیوبند کا مدرسہ جس کا آغاز ایک درخت کے نیچے ایک استاد (مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ) اور چند شاگردوں سے ہوا‘ اس مدرسہ نے ایسے عالمِ دین پیدا کیے کہ انسان کی عقل حیرت سے گم ہو جاتی ہے کہ دورانِ غلامی ایسی عظیم ہستیوں نے کیسے جنم لیا۔ پھر وقت گزرنے کے ساتھ جب حالات کے قدرے موافق ہونے پر علماء نے اپنی محصوری ختم کی اور جمعیت العلمائے ہند وجود میں آئی تو اس میں اکثریت اسی مدرسہ سے تعلیمی فیض حاصل کرنے والوں کی تھی۔ ان میں سے چند ایک کے اسمائے گرامی ہم قارئین کے علم میں لانا چاہیں گے: شیخ الہند مولانا محمود حسن‘ سید حسین احمد مدنی‘ مولانا عزیز گل‘ مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی‘ مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد بہاری‘ مولانا سید سلیمان ندوی‘ مولانا انور شاہ کاشمیری‘ مولانا شاہ معین الدین اجمیری‘ مولانا ابوالکلام آزاد‘ مولانا عبدالحق مدنی (رحمہم اللہ)۔ یہ وہ غلامانِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم تھے جن کی علمی فضیلت اور بلند و بالا کردار کی یہ کیفیت تھی کہ اگر آج کا عام آدمی ہی نہیں ایک عالم فاضل بھی سر اٹھا کر نگاہ ڈالنا چاہے تو اس کے سر پر ٹوپی قائم نہ رہ سکے گی۔

جب ۱۹۰۶ء میں قائم ہونے والی مسلم لیگ نے ہندو کے طرزِ عمل کا حقیقت پسندانہ جائزہ لیتے ہوئے اپنے موقف کو آزادیٔ ہند سے آگے بڑھاتے ہوئے مسلمانانِ ہند کے لیے علیحدہ وطن ''پاکستان'' کا مطالبہ کر دیا تو جمعیت العلمائے ہند نے اس مطالبے کی مخالفت کی اور اسے مسلمانانِ ہند کے لیے نقصان کا سودا قرار دیا۔ لیکن تحریک پاکستان کی عوامی مقبولیت میں بڑی تیزی سے اضافہ ہوا۔ بدقسمتی سے اس موقع پر جمعیت العلمائے ہند کے اتحاد میں دراڑ آ گئی۔ مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کی قیادت میں ایک دھڑے نے تحریک پاکستان کی حمایت کر دی۔ بہرحال جمعیت کا بڑا دھڑا اور مسلم لیگ مسلمانانِ ہند کے مستقبل کے حوالے سے آمنے سامنے

آ گئے۔ افسوس پون صدی سے زائد وقت گزرنے کے باوجود آج بھی بعض مسلم لیگی دانشور اور جمعیت سے منسلک بعض مذہبی رہنما اس اختلاف کو ختم نہیں کر سکے‘ لہٰذا جمعیت سے قلبی تعلق رکھنے والے بعض رہنما قائداعظم کو انگریز کا ایجنٹ اور نہ جانے کیا کیا کہتے ہیں تو بعض دانشور جمعیت کے ان رہنماؤں کے بارے میں جنہوں نے پاکستان کی مخالفت کی تھی‘ جو منہ میں آتا ہے بے دھڑک کہہ دیتے ہیں۔

ہم سمجھتے ہیں یہ دو طرفہ فکری انتہا پسندی ہے۔ ہماری رائے میں مسلمانانِ ہند سے دونوں یعنی جمعیت اور مسلم لیگ مخلص تھے۔ دونوں مسلمانوں کا بھلا چاہتے تھے‘ صرف لائحہ عمل اور طریقہ کار میں فرق تھا۔ قائداعظم اور ان کے ساتھی بھانپ چکے تھے کہ جمہوریت اور سیکولرازم جس طرح دنیا بھر میں قدم جما چکے ہیں‘ آنے والے وقت میں یہ دنیا پر مکمل طور پر مسلط ہو جائیں گے اور اقلیت کبھی اکثریت کا مقابلہ نہ کر سکے گی‘ کیونکہ اب جنگ تلوار سے نہیں ووٹ سے لڑی جائے گی اور تلوار بھی اس کی مضبوط ہو گی جس کو ووٹ کی طاقت حاصل ہو گی‘ لہٰذا جمہوری اور سیکولر ہندوستان میں مسلمان دب کر بلکہ ہندو کے غلام بن کر رہ جائیں گے۔ جبکہ جمعیت کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ پاکستان بننے سے ہندوستان میں مسلمانوں کی طاقت تقسیم ہو جائے گی۔ علاوہ ازیں چونکہ مسلم لیگ کی قیادت عملی لحاظ سے اسلام سے دور ہے لہٰذا پاکستان اسلامی ریاست بھی نہیں بن سکے گا۔

ہماری رائے میں دونوں طرف سے دلائل مضبوط ہیں اور آج کے حالات نے دونوں کے خدشات کو کم وبیش درست ثابت کیا ہے۔ پاکستان حقیقتاً اسلامی ریاست نہ بن سکا بلکہ سرمایہ دار اور جاگیردار کی چراگاہ بن گیا۔ یہ بھی درست ہے کہ کئی مرتبہ اسے ناکام ریاست قرار دیے جانے کا خطرہ لاحق ہوا ہے۔ اس وقت بھی اس کی کمر پر قرضوں کا اتنا بوجھ ہے کہ آسانی سے اس کی کمر سیدھی ہوتی نظر نہیں آتی۔ سیاسی انتشار عروج پر ہے‘ معاشرتی اور ثقافتی سطح پر اپنی بنیاد سے دور ہٹ چکا ہے‘ لیکن ـــــ اور یہ بہت بڑا لیکن ہے ـــــ دوسری طرف بھارت جس طرح ہندو ریاست میں تبدیل ہو رہا ہے اور مسلمانوں کے لیے بھارت میں زندگی جس طرح عذاب بن گئی ہے.....

آج بی جے پی کے نو وزرائے اعلیٰ ہیں جو سب کے سب آر ایس ایس کے پرچارک ہیں۔ بھارت گائے کے گوشت کا سب سے بڑا ایکسپورٹر ہے‘ لیکن مسلمان گائے ذبح کرے تو ہندو مسلمان کو ذبح کر دیتے ہیں۔ ’’مسلمانوں کے دو استھان‘ پاکستان یا قبرستان‘‘ بھارت کا مقبول ترین نعرہ بن چکا ہے۔ ہندوستان کے مسلمانوں سے کھلم کھلا مطالبہ ہو رہا ہے کہ تمہارے آباء و اَجداد ہندو تھے‘ لہٰذا تم ہندو مذہب میں واپس آ ؤ!



یہ دلیل بھی کمزور اور غیر منطقی دکھائی دیتی ہے کہ مسلمان تقسیم نہ ہوتے تو ان کی طاقت زیادہ ہوتی اور ہندو ظلم نہ کر سکتے۔ یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ آج ریاست عوام سے انتہائی زیادہ طاقتور ہے۔ بے چارے اقلیتی عوام اکثریتی گروہ کی حکومت سے ٹکرانے سے بربادی کے سوا کچھ حاصل نہیں کر سکتے۔ حکومتی گروہ اور عوام اگر ایک مذہب یا نظریہ سے تعلق رکھتے ہوں تو آج بھی کچھ نہ کچھ امکانات ہیں کہ ریاستی قوت عوام کے سامنے جھک جائے‘ لیکن اگر ریاستی قوت کا تعلق بھی اکثریتی عوام سے ہو اور عوام کی اکثریت اقلیت سے بغض رکھتی ہو تو پھر وہی کچھ ہوتا ہے جو آج بھارت میں ہو رہا ہے۔ شاید دنیا کے کسی حصہ میں آج اقلیت اتنی بری طرح نہیں پِس رہی جیسی بھارت میں پِس رہی ہے۔ چنانچہ بادیٔ النظر میں ریاستی سطح پر پاکستان کی تمام تر ناکامیوں کے باوجود قائداعظم اور مسلم لیگ کا مسلمانانِ ہند کے لیے الگ وطن حاصل کرنا ترجیحاً بہتر فیصلہ معلوم ہوتا ہے۔ پاکستان کی ناکامیاں کسی وقت کامیابیوں میں تبدیل ہو سکتی ہیں‘ بلکہ ہماری رائے میں ایسی صورت میں مسلمانانِ بھارت کے لیے پاکستان نجات دہندہ ثابت ہو گا۔ ان شاء اللہ!

بہرحال ہم اس بات کا اعادہ کرنا بھی ضروری سمجھیں گے کہ جو دانشور حضرات جمعیت العلمائے ہند کے اکابرین کے خلاف اول فول بکتے رہتے ہیں اور مسلمانانِ ہند کے حوالہ سے ان کے خلوص و اخلاص پر شک وشبہ کا اظہار کرتے ہیں ہم اسے بلا پس وپیش احمقانہ اور جاہلانہ طرزِ عمل قرار دیتے ہیں۔ وہ یقیناً انتہائی مخلص لوگ تھے۔ اسلام اور مسلمانوں کے حوالے سے ان کی خدمات انتہائی قابل قدر ہیں۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ قیامِ پاکستان کے بعد ان بزرگوں میں سے کسی نے پاکستان کے بارے میں منفی بات نہیں کی‘ بلکہ پاکستان کے اچھے مستقبل کے لیے دعا کی۔ مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے سنہری حروف میں لکھے جانے والے اس جملے کو کون فراموش کر سکتا ہے کہ: ’’مسجد کی تعمیر سے قبل اختلاف کیا جا سکتا ہے کہ اسے کہاں بنایا جائے اور کہاں نہ بنایا جائے‘ لیکن جب مسجد تعمیر ہو جائے تو اب وہ سب مسلمانوں کے لیے مقدس ہے‘ اس کی حفاظت سب مسلمانوں کا فریضہ ہے۔‘‘

ہم نے جمعیت العلمائے ہند کو زیر بحث لانے کی جرأت اس لیے کی ہے کہ جے یو آئی (ف) نے مولانا فضل الرحمٰن کی سربراہی میں جمعیت کے قیام کی صد سالہ تقریبات منانے کے لیے پاکستان میں سہ روزہ کانفرنس منعقد کی ہے‘ جس میں عالمی شخصیات نے بھی شرکت کی ہے۔ کانفرنس عوامی شرکت اور دینی وسیاسی رہنماؤں کے خطابات کے حوالے سے بہت کامیاب رہی۔ ہم چاہیں گے کہ تقسیم ہند کے بعد جب پاکستان میں منتقل ہونے والے علماء نے جمعیت کو جمعیت

العلمائے اسلام پاکستان کا نام دیا تو اس کی کارکردگی کو بھی قارئین کے سامنے لایا جائے۔ افسوس جمعیت میں اتحاد قائم نہ رہ سکا۔ پہلے ہزاروی گروپ قائم ہوا' آج جے یو آئی ''ف'' اور ''س'' میں تقسیم ہے۔ دونوں گروہ سیاسی بلکہ انتخابی میدان میں موجود ہیں۔ دونوں کی طاقت پاکستان کے آبادی کے لحاظ سے سب سے بڑے صوبہ پنجاب میں تو بہت کم ہے' بلکہ نہ ہونے کے برابر ہے' البتہ جمعیت صوبہ خیبر پختونخوا اور بلوچستان میں کافی اثر اور حمایت رکھتی ہے۔ صوبہ سندھ کے دیہی علاقوں میں بھی کچھ نہ کچھ حمایت موجود ہے۔ جمعیت العلمائے اسلام (ف) کا اثر و رسوخ دوسرے دھڑے سے وسیع بھی ہے اور گہرا بھی ہے۔ مولانا فضل الرحمٰن سیاسی جوڑ توڑ میں کئی بار اپنی شخصیت کا لوہا منوا چکے ہیں۔

اگرچہ تنظیم اسلامی کے مطابق پاکستان میں اسلام کے نظامِ عدلِ اجتماعی کا قیام بذریعہ انتخابات ممکن نہیں' بلکہ یہ ایک انقلاب کے ذریعے ہی ممکن ہوگا' لیکن اس کے باوجود ہم نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ ہمارا لائحہ عمل ہی حتمی یا حرفِ آخر ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمدؒ فرمایا کرتے تھے کہ ہمیں آم کھانے سے غرض ہے' پیڑ گننے سے نہیں۔ اگر ہماری سوچ کے بالکل برعکس انتخابات سے یا کسی بھی دوسرے ذریعے سے پاکستان صحیح معنوں میں اسلامی فلاحی ریاست بن جاتا ہے جس میں حقیقی طور پر اور عملی لحاظ سے بلا استثناء قرآن اور سنت کو مکمل بالادستی حاصل ہو جاتی ہے تو ہم کبھی یہ رویہ اختیار نہیں کریں گے کہ چونکہ یہ ہمارے تجویز کردہ طریقے سے نہیں ہوا لہٰذا بلاوجہ کے اعتراضات وارد کرو۔ ویسے تو ہم تمام اسلامی جماعتوں سے مخاطب ہیں' لیکن اس وقت چونکہ جے یو آئی (ف) جمعیت العلمائے ہند کا صد سالہ جشن منا کر اپنا تعلق اس جماعت سے جوڑ رہی ہے لہٰذا ان کی خدمت میں خاص طور پر عرض کریں گے کہ اگر ایسی عظیم جماعت اور ایسی قابلِ احترام ہستیوں سے اپنا رشتہ جوڑنا ہے تو ضرور ایسا کریں' کسی کو اعتراض نہیں ہونا چاہیے' نہ آپ کے انتخابات میں حصہ لینے کو غلط کہیں گے (کیونکہ بقول آپ کے اس طرح اقتدار حاصل کر کے اسلام کا نفاذ ہو سکتا ہے) لیکن اس صورت میں بہت سے معاملات میں آپ کو زبردست یوٹرن لینا ہوگا۔ ماضی میں آپ کے بعض اقدامات کا ہمارے لیے دفاع ممکن نہیں۔

ایم ایم اے کی صورت میں ایک انتخابی اتحاد بنایا گیا' بڑی اچھی بات ہوئی' لیکن یہ ایم ایم اے اگر فوجی مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر سے تعاون کرے..... ہمارے نزدیک اس کا فوجی ہونا بھی گوارا کیا جا سکتا تھا اگر وہ کھلم کھلا اسلام دشمنی کا مظاہرہ نہ کرتا۔ اسلام دشمنی کے حوالے سے اس کے کارنامے گنوانا ایک طویل اور قابلِ نفرت عمل ہے—— لیکن آپ کا تعاون جاری رہا۔ آئین کی



سترہویں ترمیم میں آپ نے اس کی مدد کی۔ وہ حقوقِ نسواں کا بل اسمبلی میں لایا آپ نے اسے غیر اسلامی کہا لیکن آپ کا ساتھ پھر بھی چلتا رہا۔ آپ صدر زرداری کی حکومت میں ان سے تعاون کر رہے تھے جو قرآن اور حدیث کے بارے میں توہین آمیز بات کرتا ہے۔ آپ نے ۲۰۱۳ء کے انتخابات میں اے این پی سے تعاون کیا جو اعلانیہ طور پر ایک سیکولر جماعت ہے۔ آپ اِس وقت لبرل ازم کے علمبردار' ہندوؤں سے اظہارِ محبت کرنے والے اور قادیانیوں کو اپنا بھائی کہنے والے نواز شریف کے دست راست بنے ہوئے ہیں۔ ''تحفظِ حقوقِ نسواں'' جیسے غیر شرعی بل کو قانون بنوانے والوں سے آپ بغل گیر ہوں گے تو پھر یہ جُبّہ و دستار چہ معنی دارد؟

آپ ایک طرف ایسی عظیم ہستیوں سے خود کو جوڑتے ہیں جنہوں نے اپنی زندگیاں دین متین کے لیے وقف کر دی تھیں' جنہوں نے ملحدوں اور دین دشمنوں سے جنگ کرتے ہوئے ساری زندگی بتا دی' لیکن جو محفل آپ ان سے نسبت قائم کرنے کے لیے سجاتے ہیں' جس میں آپ کٹر سیکولر رضا ربانی (چیئرمین سینیٹ) اور اسلام اور پاکستان سے کھلواڑ کرنے والے محمود خان اچکزئی کو پلیٹ فارم فراہم کرتے ہیں تو پھر حضرت سیاست کیجیے' اقتدار حاصل کیجیے اور جو جی میں آئے کیجیے۔ خدارا اس عظیم جماعت اور ان عظیم ہستیوں سے اپنا رشتہ نہ جوڑیں۔ ان کی عظمت کو اپنے اقتدار کی سیڑھی مت بنائیں۔ خدارا سیاست میں بھی صرف اللہ اور رسول ﷺ سے مخلص لوگوں سے اپنا تعلق جوڑیں۔ اسلامی نظام پاکستان میں نافذ کرنے کے لیے چاہے انتخابات کے ذریعے کوشش کریں' ہم آپ کے لیے دعا گو رہیں گے۔ اور اگر آپ ایک انقلابی اتحاد قائم کر کے پاکستان میں اسلامی نظام کے قیام کے لیے کوئی تحریک شروع کریں تو ہم آپ کی قیادت میں ایک کارکن کی حیثیت سے ہر قسم کی خدمت کرنے کو تیار ہیں۔ ہم بہت چھوٹے ہیں' لیکن ہم نے دوستی اور دشمنی کے لیے اسلام کو کسوٹی بنایا ہے۔ ہمارا رشتہ افراد سے نہیں' نظریہ سے ہے۔ آپ آج سیکولروں اور لبرل ازم کے پرچارکوں کو اپنے سے الگ کریں اور پاکستان میں اسلام کے نفاذ کے لیے ڈٹ جائیں۔ پاکستان میں خالصتاً اور صرف نفاذِ اسلام کے لیے جِدّوجُہد کریں۔ آپ کا تعلق نہ صرف جمعیت العلمائے ہند سے بلکہ تحریکِ شہیدین سے بھی جڑ جائے گا۔ اسی صورت میں ہم آپ کو سپہ سالار تسلیم کر کے آپ کے سپاہی بن جائیں گے۔ کاش ایسا ہو جائے! اے کاش ایسا ہو جائے!! اے اللہ ہمارے لیے صحیح راستہ آسان کر دے۔ آمین یاربّ العالمین!

❁❁❁

دورۂ ترجمۂ قرآن

ڈاکٹر اسرار احمد

# سُورۃُ العَنکبُوت

## آیات ۱۴ تا ۴۴

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰی قَوْمِہٖ فَلَبِثَ فِیْھِمْ اَلْفَ سَنَۃٍ اِلَّا خَمْسِیْنَ عَامًا ؕ
فَاَخَذَھُمُ الطُّوْفَانُ وَھُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۱۴﴾ فَاَنْجَیْنٰہُ وَاَصْحٰبَ السَّفِیْنَۃِ
وَجَعَلْنٰھَآ اٰیَۃً لِّلْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۵﴾ وَاِبْرٰھِیْمَ اِذْ قَالَ لِقَوْمِہِ اعْبُدُوا اللّٰہَ وَاتَّقُوْہُ ؕ
ذٰلِکُمْ خَیْرٌ لَّکُمْ اِنْ کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۶﴾ اِنَّمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ اَوْثَانًا
وَّتَخْلُقُوْنَ اِفْکًا ؕ اِنَّ الَّذِیْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ لَا یَمْلِکُوْنَ لَکُمْ
رِزْقًا فَابْتَغُوْا عِنْدَ اللّٰہِ الرِّزْقَ وَاعْبُدُوْہُ وَاشْکُرُوْا لَہٗ ؕ اِلَیْہِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۱۷﴾
وَاِنْ تُکَذِّبُوْا فَقَدْ کَذَّبَ اُمَمٌ مِّنْ قَبْلِکُمْ ؕ وَمَا عَلَی الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ
الْمُبِیْنُ ﴿۱۸﴾ اَوَلَمْ یَرَوْا کَیْفَ یُبْدِئُ اللّٰہُ الْخَلْقَ ثُمَّ یُعِیْدُہٗ ؕ اِنَّ ذٰلِکَ عَلَی
اللّٰہِ یَسِیْرٌ ﴿۱۹﴾ قُلْ سِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا کَیْفَ بَدَاَ الْخَلْقَ ثُمَّ اللّٰہُ
یُنْشِئُ النَّشْاَۃَ الْاٰخِرَۃَ ؕ اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۲۰﴾ یُعَذِّبُ مَنْ
یَّشَآءُ وَیَرْحَمُ مَنْ یَّشَآءُ ۚ وَاِلَیْہِ تُقْلَبُوْنَ ﴿۲۱﴾ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِیْنَ فِی
الْاَرْضِ وَلَا فِی السَّمَآءِ ۫ وَمَا لَکُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ مِنْ وَّلِیٍّ وَّلَا نَصِیْرٍ ﴿۲۲﴾
وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا بِاٰیٰتِ اللّٰہِ وَلِقَآئِہٖٓ اُولٰٓئِکَ یَئِسُوْا مِنْ رَّحْمَتِیْ وَاُولٰٓئِکَ
لَھُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ﴿۲۳﴾ فَمَا کَانَ جَوَابَ قَوْمِہٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوا اقْتُلُوْہُ اَوْ حَرِّقُوْہُ
فَاَنْجٰىہُ اللّٰہُ مِنَ النَّارِ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ ﴿۲۴﴾ وَقَالَ اِنَّمَا
اتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ اَوْثَانًا ۙ مَّوَدَّۃَ بَیْنِکُمْ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا ۚ ثُمَّ یَوْمَ



الْقِیٰمَۃِ یَکْفُرُ بَعْضُکُمْ بِبَعْضٍ وَّیَلْعَنُ بَعْضُکُمْ بَعْضًا ۫ وَّمَاْوٰىکُمُ النَّارُ وَمَا
لَکُمْ مِّنْ نّٰصِرِیْنَ ﴿۲۵﴾ فَاٰمَنَ لَہٗ لُوْطٌ ۘ وَقَالَ اِنِّیْ مُھَاجِرٌ اِلٰی رَبِّیْ ؕ اِنَّہٗ ھُوَ
الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ ﴿۲۶﴾ وَوَھَبْنَا لَہٗٓ اِسْحٰقَ وَیَعْقُوْبَ وَجَعَلْنَا فِیْ ذُرِّیَّتِہِ النُّبُوَّۃَ
وَالْکِتٰبَ وَاٰتَیْنٰہُ اَجْرَہٗ فِی الدُّنْیَا ۚ وَاِنَّہٗ فِی الْاٰخِرَۃِ لَمِنَ الصّٰلِحِیْنَ ﴿۲۷﴾
وَلُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِہٖٓ اِنَّکُمْ لَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَۃَ ۫ مَا سَبَقَکُمْ بِھَا مِنْ اَحَدٍ
مِّنَ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۲۸﴾ اَئِنَّکُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ وَتَقْطَعُوْنَ السَّبِیْلَ ۙ وَتَاْتُوْنَ
فِیْ نَادِیْکُمُ الْمُنْکَرَ ؕ فَمَا کَانَ جَوَابَ قَوْمِہٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوا ائْتِنَا بِعَذَابِ
اللّٰہِ اِنْ کُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِیْنَ ﴿۲۹﴾ قَالَ رَبِّ انْصُرْنِیْ عَلَی الْقَوْمِ
الْمُفْسِدِیْنَ ﴿۳۰﴾ وَلَمَّا جَآءَتْ رُسُلُنَآ اِبْرٰھِیْمَ بِالْبُشْرٰی ۙ قَالُوْٓا اِنَّا مُھْلِکُوْٓا
اَھْلِ ھٰذِہِ الْقَرْیَۃِ ۚ اِنَّ اَھْلَھَا کَانُوْا ظٰلِمِیْنَ ﴿۳۱﴾ قَالَ اِنَّ فِیْھَا لُوْطًا ؕ
قَالُوْا نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَنْ فِیْھَا ۫ لَنُنَجِّیَنَّہٗ وَاَھْلَہٗٓ اِلَّا امْرَاَتَہٗ ۖ کَانَتْ مِنَ
الْغٰبِرِیْنَ ﴿۳۲﴾ وَلَمَّآ اَنْ جَآءَتْ رُسُلُنَا لُوْطًا سِیْٓءَ بِھِمْ وَضَاقَ بِھِمْ ذَرْعًا
وَّقَالُوْا لَا تَخَفْ وَلَا تَحْزَنْ ۫ اِنَّا مُنَجُّوْکَ وَاَھْلَکَ اِلَّا امْرَاَتَکَ کَانَتْ مِنَ
الْغٰبِرِیْنَ ﴿۳۳﴾ اِنَّا مُنْزِلُوْنَ عَلٰٓی اَھْلِ ھٰذِہِ الْقَرْیَۃِ رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا
کَانُوْا یَفْسُقُوْنَ ﴿۳۴﴾ وَلَقَدْ تَّرَکْنَا مِنْھَآ اٰیَۃًۢ بَیِّنَۃً لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ﴿۳۵﴾ وَاِلٰی
مَدْیَنَ اَخَاھُمْ شُعَیْبًا ۙ فَقَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰہَ وَارْجُوا الْیَوْمَ الْاٰخِرَ وَلَا
تَعْثَوْا فِی الْاَرْضِ مُفْسِدِیْنَ ﴿۳۶﴾ فَکَذَّبُوْہُ فَاَخَذَتْھُمُ الرَّجْفَۃُ فَاَصْبَحُوْا
فِیْ دَارِھِمْ جٰثِمِیْنَ ﴿۳۷﴾ وَعَادًا وَّثَمُوْدَا وَقَدْ تَّبَیَّنَ لَکُمْ مِّنْ مَّسٰکِنِھِمْ ۫
وَزَیَّنَ لَھُمُ الشَّیْطٰنُ اَعْمَالَھُمْ فَصَدَّھُمْ عَنِ السَّبِیْلِ وَکَانُوْا
مُسْتَبْصِرِیْنَ ﴿۳۸﴾ وَقَارُوْنَ وَفِرْعَوْنَ وَھَامٰنَ ۫ وَلَقَدْ جَآءَھُمْ مُّوْسٰی
بِالْبَیِّنٰتِ فَاسْتَکْبَرُوْا فِی الْاَرْضِ وَمَا کَانُوْا سٰبِقِیْنَ ﴿۳۹﴾ فَکُلًّا اَخَذْنَا
بِذَنْۢبِہٖ ۚ فَمِنْھُمْ مَّنْ اَرْسَلْنَا عَلَیْہِ حَاصِبًا ۚ وَمِنْھُمْ مَّنْ اَخَذَتْہُ
الصَّیْحَۃُ ۚ وَمِنْھُمْ مَّنْ خَسَفْنَا بِہِ الْاَرْضَ ۚ وَمِنْھُمْ مَّنْ اَغْرَقْنَا ۚ وَمَا
کَانَ اللّٰہُ لِیَظْلِمَھُمْ وَلٰکِنْ کَانُوْٓا اَنْفُسَھُمْ یَظْلِمُوْنَ ﴿۴۰﴾ مَثَلُ الَّذِیْنَ

اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْلِيَآءَ كَمَثَلِ الْعَنْكَبُوْتِ ۚ اِتَّخَذَتْ بَيْتًا ؕ وَاِنَّ
اَوْهَنَ الْبُيُوْتِ لَبَيْتُ الْعَنْكَبُوْتِ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۝ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا
يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَيْءٍ ؕ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ
نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ ۚ وَمَا يَعْقِلُهَآ اِلَّا الْعٰلِمُوْنَ ۝ خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ
وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۝

یہاں سے سورت کے دوسرے حصے کا آغاز ہو رہا ہے۔ یہ حصہ تین رکوعوں پر مشتمل ہے اور اس میں بنیادی طور پر انباء الرسل کا مضمون ہے‘ لیکن وقفے وقفے سے بین السطور میں مکّے کے ماحول میں جاری کش مکش کی طرف بھی اشارے ملتے ہیں۔ اس کے بعد آخری تین رکوعوں پر مشتمل اس سورت کے آخری حصے میں مشرکین اور اہلِ ایمان سے خطاب ہے۔ یہ دونوں موضوعات سورت کے آخری حصے میں یوں متوازی چلتے نظر آتے ہیں جیسے ایک رسّی کی دو ڈوریاں آپس میں گندھی ہوئی ہوں۔ ان میں سے کبھی ایک ڈوری نمایاں ہوتی نظر آتی ہے تو کبھی دوسری۔ سورت کے اس حصے میں اہلِ ایمان سے خطاب کے دوران انہیں دس اہم ہدایات بھی دی گئی ہیں جو غلبۂ دین کی جدّوجُہد کرنے اور اس راستے میں مصائب و مشکلات برداشت کرنے والے مجاہدین کے لیے رہتی دنیا تک گویا مشعلِ راہ کا درجہ رکھتی ہیں۔

**آیت ۱۴** ﴿وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَلَبِثَ فِيْهِمْ اَلْفَ سَنَةٍ اِلَّا خَمْسِيْنَ عَامًا ؕ﴾ ’’اور ہم نے بھیجا تھا نوحؑ کو اُس کی قوم کی طرف‘ تو وہ رہا ان کے مابین پچاس برس کم ایک ہزار برس۔‘‘

یعنی حضرت نوح علیہ السلام اپنی قوم کے درمیان ساڑھے نو سو سال تک رہے۔ یہاں یہ نکتہ قابلِ توجہ ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کا ذکر قرآن مجید میں متعدد بار آ چکا ہے لیکن یہ بات اور کہیں نہیں کہی گئی کہ انہوں نے ساڑھے نو سو سال کا طویل عرصہ اپنی قوم کے ساتھ گزارا۔ اگر ہم مکہ کے ان حالات کا نقشہ ذہن میں رکھیں جن حالات میں یہ سورت نازل ہوئی تھی اور پہلے رکوع کا مضمون بھی مدِّنظر رکھیں تو حضرت نوح علیہ السلام کی دعوت اور جدوجہد کے ساڑھے نو سو سال کے ذکر کی وجہ صاف نظر آ جاتی ہے اور بین السطور میں یہاں جو پیغام دیا جا رہا ہے وہ اقبال کے الفاظ میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے:ؔ



یہ موجِ پریشاں خاطر کو پیغام لبِ ساحل نے دیا
ہے دُور وصالِ بحر ابھی‘ تو دریا میں گھبراہٹ بھی گئی!

کہ اے مسلمانو! تم لوگ چند برس میں ہی گھبرا گئے ہو۔ ذرا ہمارے بندے نوح علیہ السلام کی صدیوں پر محیط جاں گسل جدوجہد کا تصور کرو اور پھر ان کے صبر و استقامت کا اندازہ کرو! چنانچہ تم لوگوں کو اس راستے میں مزید امتحانات کے لیے بھی تیار رہنا چاہیے:ؔ

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں!
(اقبال)

سورۃ الانعام میں اسی حوالے سے محمدٌ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے یوں فرمایا گیا ہے:
﴿وَلَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ فَصَبَرُوْا عَلٰى مَا كُذِّبُوْا وَاُوْذُوْا حَتّٰٓى اَتٰىهُمْ نَصْرُنَا ۚ وَلَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ۚ وَلَقَدْ جَآءَكَ مِنْ نَّبَاِ الْمُرْسَلِيْنَ ۝﴾ ’’اور آپؐ سے پہلے بھی رسولوںؑ کو جھٹلایا گیا‘ تو انہوں نے اس تکذیب پر صبر کیا‘ اور انہیں ایذائیں پہنچائی گئیں یہاں تک کہ ان تک ہماری مدد پہنچ گئی۔ اور (دیکھئے اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم!) اللہ کے ان کلمات کو بدلنے والا کوئی نہیں‘ اور آپؐ کے پاس رسولوںؑ کی خبریں تو آ ہی چکی ہیں۔‘‘

﴿فَاَخَذَهُمُ الطُّوْفَانُ وَهُمْ ظٰلِمُوْنَ ۝﴾ ’’تو ان کو آ پکڑا طوفان نے اور وہ ظالم تھے۔‘‘

**آیت ۱۵** ﴿فَاَنْجَيْنٰهُ وَاَصْحٰبَ السَّفِيْنَةِ وَجَعَلْنٰهَآ اٰيَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝﴾ ’’تو ہم نے بچا لیا اُس (نوحؑ) کو اور کشتی والوں کو‘ اور اسے بنا دیا ہم نے تمام جہان والوں کے لیے ایک نشانی۔‘‘

**آیت ۱۶** ﴿وَاِبْرٰهِيْمَ اِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوْهُ ؕ﴾ ’’اور ابراہیمؑ کو (بھی رسول بنا کر بھیجا) جب اُس نے کہا اپنی قوم سے کہ اللہ کی بندگی کرو اور اُس کا تقویٰ اختیار کرو۔‘‘

﴿ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝﴾ ’’یہی تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم علم رکھتے ہو۔‘‘

**آیت ۱۷** ﴿اِنَّمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْثَانًا وَّتَخْلُقُوْنَ اِفْكًا ؕ﴾ ''جن کو تم پُوج رہے ہو اللہ کو چھوڑ کر یہ تو محض بُت ہیں' اور تم ایک جھوٹ گھڑ رہے ہو۔''

یہ جو تم نے بت اور ان کے استھان بنائے ہوئے ہیں یہ محض تمہارا افترا ہے۔ اس سب کچھ کی کہیں کوئی سند نہیں ہے' نہ عقلی طور پر اور نہ ہی اللہ کی نازل کردہ کسی کتاب میں!

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَمْلِكُوْنَ لَكُمْ رِزْقًا فَابْتَغُوْا عِنْدَ اللّٰهِ الرِّزْقَ﴾ ''جن کو تم پوجتے ہو اللہ کے سوا وہ تمہیں رزق دینے کا کچھ اختیار نہیں رکھتے' پس تم اللہ ہی کے پاس رزق کے طالب بنو۔''

اللہ ہی سے رزق مانگو' اُسی سے مشکل کشائی کی درخواست کرو اور اُسی کو حاجت روائی کے لیے پکارو۔

﴿وَاعْبُدُوْهُ وَاشْكُرُوْا لَهٗ ؕ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۱۷﴾﴾ ''اور اُسی کی بندگی کرو اور اُسی کا شکر ادا کرو۔ اُسی کی طرف تم لوٹا دیے جاؤ گے۔''

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا یہ ذکر ابھی مزید جاری رہے گا مگر یہاں درمیان میں اچانک ایک طویل جملہ معترضہ آ گیا ہے جس کے تحت خطاب کا رخ پھر سے اس کش مکش کی طرف موڑا جا رہا ہے جو مکہ میں حضور ﷺ اور مشرکین کے درمیان جاری تھی۔ چنانچہ اگلی آیت میں براہِ راست مشرکینِ مکّہ سے خطاب ہے:

**آیت ۱۸** ﴿وَاِنْ تُكَذِّبُوْا فَقَدْ كَذَّبَ اُمَمٌ مِّنْ قَبْلِكُمْ ؕ﴾ ''اور اگر تم جھٹلا رہے ہو تو (یاد رکھو کہ) تم سے پہلے بہت سی قومیں جھٹلا چکی ہیں۔''

﴿وَمَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴿۱۸﴾﴾ ''اور رسولؐ پر کوئی ذمہ داری نہیں ہے سوائے صاف صاف پہنچا دینے کے۔''

**آیت ۱۹** ﴿اَوَلَمْ يَرَوْا كَيْفَ يُبْدِئُ اللّٰهُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ ؕ﴾ ''کیا انہوں نے دیکھا نہیں کہ کس طرح اللہ پہلی بار پیدا کرتا ہے' پھر اسے دوبارہ پیدا کرے گا!''

﴿اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ﴿۱۹﴾﴾ ''یقیناً یہ اللہ پر بہت آسان ہے۔''

**آیت ۲۰** ﴿قُلْ سِيْرُوْا فِى الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ بَدَاَ الْخَلْقَ ثُمَّ اللّٰهُ يُنْشِئُ النَّشْاَةَ الْاٰخِرَةَ ؕ﴾ ''ان سے کہیے کہ ذرا گھومو پھرو زمین میں اور دیکھو کس طرح اللہ نے



پہلی بار پیدا کیا' پھر اللہ ہی اٹھاتا ہے (یا اٹھائے گا) دوسری بار!''

مخلوق کو دوبارہ پیدا کرنے کا سلسلہ اللہ تعالیٰ کی مشیت اور قدرت سے دنیا میں بھی چل رہا ہے۔ جیسے ایک فصل ختم ہوتی ہے تو دوسری پیدا ہو جاتی ہے اور وہ آخرت میں بھی انسانوں کو پھر سے زندہ کرے گا۔ یہ سب کچھ اسی کے اختیار میں ہے۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۲۰﴾﴾ ''یقیناً اللہ ہر شے پر قادر ہے۔''

**آیت ۲۱** ﴿يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ وَيَرْحَمُ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَاِلَيْهِ تُقْلَبُوْنَ ﴿۲۱﴾﴾ ''وہ جسے چاہے گا عذاب دے گا اور جس پر چاہے گا رحم فرمائے گا' اور اسی کی طرف تم لوٹا دیے جاؤ گے۔''

**آیت ۲۲** ﴿وَمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ فِى الْاَرْضِ وَلَا فِى السَّمَآءِ ۫﴾ ''اور تم اسے عاجز نہیں کر سکتے زمین میں اور نہ آسمان میں''

تم زمین یا آسمان میں کہیں بھی کسی بھی طریقے سے اس کے اختیار سے باہر نہیں نکل سکتے۔

﴿وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِىٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿۲۲﴾﴾ ''اور نہیں ہے اللہ کے مقابلے میں کوئی تمہارا حمایتی اور نہ ہی کوئی مددگار۔''

عربی میں دُوْنَ کا لفظ بہت سے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ عبارت کے سیاق وسباق سے پتا چلتا ہے کہ کس جگہ اس کے کون سے معنی مناسب ہیں۔ اس جگہ ''دُوْنِ اللّٰہ'' کا بہتر مفہوم یہی ہے کہ اللہ کے مقابلے میں تمہارا کوئی حمایتی اور مددگار نہیں ہوگا۔

**آیت ۲۳** ﴿وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَلِقَآئِهٖٓ﴾ ''اور جنہوں نے انکار کیا اللہ کی آیات کا اور اُس کی ملاقات کا''

﴿اُولٰٓئِكَ يَئِسُوْا مِنْ رَّحْمَتِىْ وَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۲۳﴾﴾ ''یہی لوگ ہیں جو مایوس ہو چکے ہیں میری رحمت سے اور یہی لوگ ہیں جن کے لیے دردناک عذاب ہے۔''

آیت ۱۸ سے شروع ہونے والا جملہ معترضہ یہاں پر ختم ہوا۔ اب اگلی آیات میں پھر سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا تذکرہ شروع ہو رہا ہے جس کا سلسلہ آیت ۱۷ سے منقطع ہو گیا تھا۔

**آیت ۲۴** ﴿فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوا اقْتُلُوْهُ اَوْ حَرِّقُوْهُ﴾ ''تو کوئی جواب نہیں تھا اُس (ابراہیمؑ) کی قوم کا سوائے اس کے کہ انہوں نے کہا: اسے قتل کر دو یا اس کو جلا دو!''

﴿فَاَنْجٰىهُ اللّٰهُ مِنَ النَّارِ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ﴿۲۴﴾﴾ ’’تو اللہ نے اُسے نجات دی آگ سے۔ یقیناً اس میں نشانیاں ہیں اُن لوگوں کے لیے جو ایمان رکھتے ہیں۔‘‘

**آیت ۲۵** ﴿وَقَالَ اِنَّمَا اتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْثَانًا ۙ مَّوَدَّةَ بَیْنِكُمْ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا ۚ﴾ ’’اور ابراہیمؑ نے کہا کہ تم لوگوں نے اللہ کے سوا جو بُت بنا رکھے ہیں یہ تو بس دنیا کی زندگی میں تمہاری آپس کی محبت کی وجہ سے ہے۔‘‘

یہ بہت اہم بات ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہی تھی کہ میں تمہیں متنبہ کر چکا ہوں کہ تم لوگ جن بُتوں کو پوجتے ہو ان کی حقیقت کچھ نہیں ہے اور ان کے پاس کوئی اختیار نہیں ہے۔ میرے سمجھانے پر تم لوگ یہ بات سمجھ بھی چکے ہو‘ اس سلسلے میں حق تم لوگوں پر پوری طرح منکشف بھی ہو چکا ہے اور تمہارے دل اس بارے میں حق کی گواہی بھی دے چکے ہیں۔ لیکن اس سب کچھ کے باوجود بھی تم لوگ اگر بتوں کے ساتھ چمٹے ہوئے ہو اور گمراہی کا راستہ چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہو‘ تو اس کی اصل وجہ اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ تم لوگ آپس کے تعلقات‘ آپس کی دوستیاں اور رشتہ داریاں نبھا رہے ہو۔ دراصل یہ وہ بنیادی عامل (factor) ہے جو ہر سطح پر لوگوں کے لیے حق کو قبول کرنے میں سب سے بڑی رکاوٹ بنتا ہے۔ ایک معقول اور باشعور شخص کی تان بھی اکثر یہیں پر آ کر ٹوٹتی ہے کہ جی ہاں بات تو درست ہے‘ دل کو بھی لگتی ہے مگر کیا کریں مجبوری ہے! دوسری طرف برادری ہے‘ رشتہ داریاں ہیں‘ دوستیاں ہیں اور کاروبار کی شراکت داریاں ہیں۔ یہ سب کچھ کیسے چھوڑ دیں؟ سب سے ناتا کیسے توڑ لیں؟ زندہ رہنے کے لیے یہ سب کچھ ضروری ہے۔ انسان بھلا اکیلا کیسے زندگی گزار سکتا ہے‘ وغیرہ وغیرہ۔

یہ عصبیت ہر جگہ اور ہر دور میں اپنا رنگ دکھاتی ہے‘ حتیٰ کہ خالص دینی بنیادوں پر اٹھنے والی تحریکیں بھی اس کا شکار ہو جاتی ہیں۔ ایسی صورت میں یہ سب کچھ یکدم نہیں ہو جاتا بلکہ منفی عصبیت کے خطرناک جراثیم آہستہ آہستہ رینگتے ہوئے کسی تحریک کی صفوں میں داخل ہوتے ہیں۔ فرض کریں کہ آغاز میں ایک تحریک کا نظریہ بالکل خلوص پر مبنی تھا۔ اس کے کارکنوں کی وابستگی بھی خالصتاً حق شناسی کی بنیاد پر تھی اور ان میں جِدّوجُہد کا جذبہ بھی قابلِ رشک تھا‘ مگر پھر



کسی موڑ پر کہیں کوئی غلطی ہوئی اور تحریک کسی غلط رخ پر مڑ گئی۔ عموماً ایسی غلطیوں کے نتائج فوری طور پر سامنے نہیں آتے‘ بلکہ کچھ عرصے تک تو کارکنوں کو محسوس بھی نہیں ہوتا کہ ان کی تحریک غلط موڑ مڑ چکی ہے۔ لیکن جب اس غلطی کے نتائج واضح طور پر سامنے آنے لگتے ہیں اور کارکنوں کو معلوم بھی ہو جاتا ہے کہ وہ غلط راستے پر جا رہے ہیں تو اس کے باوجود بھی ان کی اکثریت اس تحریک کو چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہوتی۔ ایسی صورت حال میں وہ لوگ محض ’’عصبیت‘‘ کی وجہ سے اس تحریک کے ساتھ چمٹے رہتے ہیں۔ غور سے جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ کسی بھی جماعت یا تنظیم کے اندر‘ خواہ وہ خالص دینی بنیادوں پر ہی کیوں نہ اٹھی ہو‘ کچھ دیر کے بعد شخصی تعلقات‘ باہمی رشتہ داریاں اور مشترکہ مادی مفادات بھی اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ گویا ’’جماعتی عصبیت‘‘ کے علاوہ چھوٹی چھوٹی دوسری عصبیتیں بھی اس کے حلقے کے اندر فعال ہو جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کچھ عرصے کے بعد ہر ایسی جماعت ایک فرقہ بن جاتی ہے۔

اس نکتے کو اس پہلو سے بھی سمجھنا چاہیے کہ اب نبوت ختم ہو گئی ہے اور قیامت تک دنیا میں کوئی اور نبی نہیں آئے گا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے قیامت تک کے زمانے تک اس خلا کو پُر کرنے کے لیے مندرجہ ذیل تین چیزوں کا اہتمام فرمایا ہے:

(۱) قرآن کی حفاظت کی ذمہ داری کا اہتمام۔ جبکہ اس سے پہلے کسی کتاب کی حفاظت کی ضمانت نہیں دی گئی۔

(۲) ہر صدی میں ایک مجدّد اٹھانے کا اہتمام۔ یہ مجدّد دین کے بنیادی حقائق کو تازہ کیا کرے گا اور لوگوں کو دین کی ان حقیقی تعلیمات کی طرف متوجہ کیا کرے گا جنہیں وہ بھول چکے ہوں گے۔

(۳) اس چیز کا اہتمام کہ ہر دور میں ایک جماعت ضرور حق پر قائم رہے گی۔ اس ضمن میں نبی اکرم ﷺ کا فرمان ہے: ((لَا تَزَالُ طَائِفَةٌ مِنْ اُمَّتِیْ قَائِمَةً بِاَمْرِ اللّٰهِ لَا یَضُرُّهُمْ مَنْ خَذَلَهُمْ اَوْ خَالَفَهُمْ .....))(۱) ’’میری اُمت میں سے ایک جماعت ہمیشہ اللہ کے حکم پر قائم رہے گی۔ جو لوگ ان کو چھوڑ جائیں گے یا ان کی مخالفت کریں گے وہ ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے.....‘‘

اب عملی طور پر کیا ہوتا ہے؟ اس حقیقت کو سمجھنے کے لیے فرض کریں کہ ایک مجدد پیدا ہوا‘

(۱) صحیح مسلم‘ کتاب الامارۃ‘ باب قولہ لا تزال طائفۃ من امتی ظاھرین علی الحق .....

اس نے مختلف پہلوؤں سے جدوجہد کی‘ دینی تعلیمات کی تطہیر کر کے اصل حقائق لوگوں پر واضح کر دیے۔ حالات اور زمانے کی ضروریات اور ترجیحات کے مطابق دین کے مطالبات کی تشریح کر کے لوگوں کی توجہ اس طرف مبذول کرانے کی بھرپور کوشش کی۔ کچھ لوگ اس کی شخصیت سے متاثر ہو کر اس کے گرد جمع ہوئے۔ اعوان و انصار نے اپنا اپنا کردار ادا کیا اور ایک مضبوط جماعت قائم ہو گئی۔ ایسی کسی بھی جماعت کے ہراول دستے کے کارکن چونکہ علیٰ وجہ البصیرت اس میں شامل ہوتے ہیں اس لیے ان کی نظریاتی وابستگی خالص اور مضبوط بنیادوں پر استوار ہوتی ہے۔ البتہ وقت گزرنے کے کے ساتھ ساتھ اس جماعت میں عصبیت کا عنصر داخل ہونا شروع ہو جاتا ہے اور ایک وقت آتا ہے جب اس کے بہت سے کارکنوں کی نظریاتی وابستگی کمزور ہوتے ہوتے برائے نام رہ جاتی ہے‘ لیکن وہ لوگ صرف اس لیے اس کے ساتھ چمٹے رہتے ہیں کہ ان کے بزرگوں کا تعلق اس جماعت سے تھا۔ پھر تیسری نسل تک پہنچتے پہنچتے اس عصبیت کا دائرہ اور وسیع ہو جاتا ہے۔ اتنے عرصے میں جماعت کے اندر مضبوط شخصی تعلقات پروان چڑھ چکے ہوتے ہیں‘ رشتہ داریاں بن چکی ہوتی ہیں‘ کاروباری شراکت داریاں اپنی جڑیں مضبوط کر چکی ہوتی ہیں اور یوں یہ جماعت ایک معاشرتی حلقے یا فرقے کی صورت اختیار کر جاتی ہے۔ اب اس کے کارکن اپنی اپنی ترجیحات اور اپنے اپنے مفادات کے تحت اس جماعت یا فرقے کے ساتھ خود کو وابستہ کیے رکھتے ہیں۔

تیسری نسل تک پہنچتے پہنچتے ہر جماعت میں اس خرابی کا پیدا ہونا ایک فطری عمل ہے۔ اس حوالے سے سب سے بڑی حقیقت اور دلیل حضور ﷺ کا یہ فرمان ہے: ((خَيْرُ أُمَّتِيْ قَرْنِيْ ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ))(۱) ’’میری اُمت میں سب سے بہتر میرا دور ہے‘ پھر اس کے بعد والوں کا‘ پھر اس کے بعد والوں کا‘‘۔ یعنی حضور ﷺ نے خیر کے حوالے سے درجہ بدرجہ تین نسلوں کا ذکر فرمایا ہے۔ آپؐ کا یہ فرمان اتنی بڑی حقیقت ہے کہ تین نسلوں کے بعد خود آپ ﷺ کی قائم کردہ جماعت کو بھی زوال آ گیا۔ اور جب حضور ﷺ کی قائم کردہ جماعت بھی اس فطری عمل کے مطابق زوال کا شکار ہو گئی تو کوئی دوسری جماعت کیونکر اس کمزوری سے مبرّا ہو سکتی ہے؟ چنانچہ تیسری نسل (ایک صدی) کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف سے پھر کسی مجدّد کو

(۱) صحیح البخاری‘ کتاب المناقب‘ باب فضائل اصحاب النبی ﷺ۔ وصحیح مسلم‘ کتاب فضائل الصحابۃ‘ باب فضل الصحابۃ ثم الذین یلونھم ثم الذین یلونھم۔



اٹھانے کا اہتمام کیا جاتا ہے اور وہ از سرِ نو انہی بنیادوں پر جدوجہد کا آغاز کرتا ہے۔ اسی طرح یہ عمل قیامت تک کے زمانے تک تسلسل کے ساتھ چلتا رہے گا۔

چنانچہ آیت زیر مطالعہ کے حوالے سے ہر دور کے مخلص مسلمان کا فرض ہے کہ وہ حق شناسی کے سلسلے میں خود کو ہر قسم کی عصبیت سے بالاتر رکھ کر پوری دیانت داری سے جائزہ لیتا رہے کہ اس کے دور میں اللہ نے دین کی سربلندی کا کام کس کے حوالے کیا ہے اور وہ کون سی جماعت یا شخصیت ہے جو درست انداز میں اس راہ میں جدوجہد کر رہی ہے۔ پھر جب وہ اس سلسلے میں کسی واضح اور ٹھوس نتیجے پر پہنچ جائے تو اس پر لازم ہے کہ وہ اپنے تعلقات و مفادات کو بالائے طاق رکھ کر اس شخصیت یا اس جماعت کا ساتھ دے جس کی جدوجہد کا رخ اس کی سمجھ اور معلومات کے مطابق درست ہو۔

﴿ثُمَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكْفُرُ بَعْضُكُمْ بِبَعْضٍ وَّيَلْعَنُ بَعْضُكُمْ بَعْضًا﴾ ’’پھر قیامت کے دن تم ایک دوسرے کا انکار کرو گے اور ایک دوسرے پر لعنت بھیجو گے‘‘

﴿وَّمَاْوٰىكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ۝۲۵﴾ ’’اور تم سب کا ٹھکانا آگ ہو گی اور (اس دن وہاں) تمہارا کوئی مددگار نہیں ہو گا۔‘‘

تمہاری یہ دوستیاں بس دنیا تک ہی محدود ہیں اور تمہارے یہ گٹھ جوڑ صرف یہیں پر تمہارے لیے مفید ہو سکتے ہیں۔ کل قیامت کے دن تمہارے یہ دوست اور رشتہ دار تمہیں پہچاننے سے بھی انکار کر دیں گے۔ اپنے انجام کو دیکھتے ہوئے تم لوگ آپس میں ایک دوسرے کو اس کا ذمہ دار ٹھہراؤ گے اور باہم ایک دوسرے پر لعنتیں بھیجو گے۔ اس مشکل گھڑی میں تمہارا کوئی پُرسانِ حال نہ ہو گا۔

**آیت ۲۶** ﴿فَاٰمَنَ لَهٗ لُوْطٌ﴾ ’’تو لوطؑ اُس (ابراہیمؑ) پر ایمان لایا۔‘‘

حضرت لوط علیہ السلام حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بھتیجے تھے۔

﴿وَقَالَ اِنِّيْ مُهَاجِرٌ اِلٰى رَبِّيْ ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝۲۶﴾ ’’اور ابراہیمؑ نے کہا کہ میں اپنے رب کی طرف ہجرت کر رہا ہوں۔ یقیناً وہ زبردست ہے‘ کمال حکمت والا۔‘‘

اس کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام عراق کو چھوڑ کر شام کی طرف ہجرت کر گئے۔ آپؑ کے پیچھے آپؑ کی قوم کے ساتھ کیا معاملہ ہوا؟ اس بارے میں قرآن سے ہمیں کوئی اشارہ نہیں ملتا۔ واللہ اعلم!

**آیت ۲۷** ﴿وَوَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ﴾ ’’اور ہم نے اسے اسحاقؑ (جیسا بیٹا) اور یعقوبؑ (جیسا پوتا) عطا کیا‘‘

﴿وَجَعَلْنَا فِيْ ذُرِّيَّتِهِ النُّبُوَّةَ وَالْكِتٰبَ﴾ ’’اور اُس کی نسل میں ہم نے رکھ دی نبوت اور کتاب‘‘

نبوت اور کتاب کی یہ وراثت ایک طویل عرصے تک حضرت اسحاق علیہ السلام کی نسل میں رہی اور پھر آخری نبوت اور آخری کتاب کی سعادت حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد کے حصے میں آئی۔ اس حوالے سے ایک اہم نکتہ نوٹ کر لیجیے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بعد دنیا میں کوئی نبی یا رسول آپؑ کی نسل سے باہر نہیں آیا۔ لیکن آپؑ کی نسل دنیا میں کہاں کہاں پھیلی؟ اس بارے میں ہمیں قطعی معلومات حاصل نہیں ہیں۔ تورات نے تو حضرت اسحاق علیہ السلام کے صرف ایک بیٹے یعنی حضرت یعقوب علیہ السلام کی نسل (بنی اسرائیل) کے بارے میں معلومات کو محفوظ کیا ہے۔ حضرت یعقوبؑ کے ایک جڑواں بھائی ’’عیسو‘‘ کا ذکر بھی تاریخ میں ملتا ہے لیکن ان کی نسل کے بارے میں ہمیں کچھ علم نہیں کہ وہ کہاں کہاں آباد ہوئی۔ اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تیسری بیوی ’’قطورہ‘‘ سے بھی آپؑ کے بہت سے بیٹے تھے۔ ان میں سے آپؑ کے صرف ایک بیٹے کا تاریخ میں تذکرہ ملتا ہے کہ وہ مدین میں آباد ہوئے تھے اور حضرت شعیب علیہ السلام کا تعلق ان ہی کی نسل سے تھا۔ لیکن ’’بنی قطورہ‘‘ میں سے باقی لوگ کدھر گئے کچھ معلوم نہیں۔

اس حوالے سے میرا خیال ہے کہ حضرت اسحاق علیہ السلام کے بیٹے عیسو کی اولاد میں سے کچھ لوگ ہندوستان میں آ کر آباد ہوئے اور برہمن کہلوائے۔ میرے خیال میں یہ لوگ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ نسلی تعلق کی بنا پر خود کو ’’براہم‘‘ یا ’’براہما‘‘ کہلواتے تھے۔ بعد میں اسی براہم یا براہما کا لفظ ’’برہمن‘‘ بن گیا۔ واللہ اعلم! بہرحال حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسل دنیا میں کہاں کہاں پھیلی اور کس کس علاقے میں آباد ہوئی‘ یہ انسانی تاریخ کا ایک اہم لیکن گمنام باب ہے۔ آج ضرورت ہے کہ اعلیٰ پائے کا کوئی سکالر تحقیق کر کے اس موضوع کے گمنام گوشوں کو بے نقاب کرے۔

﴿وَاٰتَيْنٰهُ اَجْرَهٗ فِي الدُّنْيَا ۚ وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝۲۷﴾ ’’اور ہم نے اسے دنیا میں بھی اس کا اجر عطا کیا‘ اور آخرت میں بھی وہ یقیناً ہمارے نیک بندوں میں سے ہوگا۔‘‘



**آیت ۲۸** ﴿وَلُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖٓ اِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ ۡ مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ۝۲۸﴾ ’’اور (ہم نے بھیجا) لوطؑ کو‘ جب اُس نے اپنی قوم سے کہا کہ تم لوگ ایسی بے حیائی کا ارتکاب کر رہے ہو جو تم سے پہلے تمام جہان والوں میں سے کسی نے نہیں کی۔‘‘

حضرت لوط علیہ السلام کو عامورہ اور سدوم کے شہروں کی طرف مبعوث کیا گیا تھا۔ ان شہروں کے لوگ آپؑ کی قوم میں سے نہیں تھے‘ چنانچہ آیت زیر نظر میں انہیں مجازاً آپؑ کی قوم (قَوْمِہٖ) کہا گیا ہے۔ اس سلسلے میں اللہ تعالیٰ کا قاعدہ یہی رہا ہے کہ کسی بھی قوم کی طرف رسول ہمیشہ اس قوم کے اندر سے مبعوث کیا جاتا رہا ہے۔ اس قاعدے اور قانون میں حضرت لوط علیہ السلام کے حوالے سے یہ واحد استثناء ہے اور یہ استثناء بھی دراصل اللہ تعالیٰ کے اس فیصلے کا حصہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بعد جو کوئی بھی پیغمبر ہوگا وہ آپؑ کی قوم سے ہی ہوگا۔ یاد رہے کہ حضرت لوط علیہ السلام حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بھتیجے تھے۔

**آیت ۲۹** ﴿اَىِٕنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ وَتَقْطَعُوْنَ السَّبِيْلَ ۙ۵﴾ ’’کیا تم آتے ہو مَردوں کے پاس (شہوت رانی کے لیے) اور (فطری) راستہ منقطع کرتے ہو‘‘

یعنی فطرت نے اس مقصد کے لیے مرد اور عورت کے ملاپ کا جو طریقہ رکھا ہے اور اسے اولاد پیدا کرنے کا ذریعہ بنایا ہے‘ تم اس راہ کو کاٹ رہے ہو۔

﴿وَتَاْتُوْنَ فِيْ نَادِيْكُمُ الْمُنْكَرَ ۭ﴾ ’’اور یہ مذموم فعل تم اپنی مجلسوں کے اندر کرتے ہو!‘‘

ان کی بے حیائی اور ڈھٹائی کی انتہا یہ تھی کہ وہ اس گھناؤنے فعل کا ارتکاب کھلے عام اپنی مجالس کے اندر کیا کرتے تھے۔

﴿فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوا ائْتِنَا بِعَذَابِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝۲۹﴾ ’’تو اس کی قوم کا کوئی جواب اس کے سوا نہیں تھا کہ انہوں نے کہا: تم لے آؤ ہم پر اللہ کا عذاب اگر تم سچے ہو!‘‘

**آیت ۳۰** ﴿قَالَ رَبِّ انْصُرْنِيْ عَلَى الْقَوْمِ الْمُفْسِدِيْنَ ۝۳۰﴾ ’’اُس نے دعا کی: اے میرے پروردگار! میری مدد فرما اس مفسد قوم کے خلاف۔‘‘

**آیت ۳۱** ﴿وَلَمَّا جَآءَتْ رُسُلُنَآ اِبْرٰهِيْمَ بِالْبُشْرٰى﴾ ''اور جب ہمارے فرستادے ابراہیمؑ کے پاس بشارت لے کر آئے''

قومِ لوط پر عذاب کی غرض سے جو فرشتے بھیجے گئے تھے وہ پہلے انسانی شکلوں میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس گئے۔ ان فرشتوں نے پہلے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حضرت اسحاق علیہ السلام کی پیدائش کی بشارت دی اور پھر اس کے بعد:

﴿قَالُوْٓا اِنَّا مُهْلِكُوْٓا اَهْلِ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ ۚ اِنَّ اَهْلَهَا كَانُوْا ظٰلِمِيْنَ ۝۳۱﴾ ''انہوں نے کہا کہ ہم اس بستی والوں کو ہلاک کرنے والے ہیں۔ یقیناً اس کے باسی بڑے ظالم ہیں۔''

**آیت ۳۲** ﴿قَالَ اِنَّ فِيْهَا لُوْطًا ۭ﴾ ''ابراہیم علیہ السلام نے کہا کہ اس میں لوطؑ بھی تو ہے!''

﴿قَالُوْا نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَنْ فِيْهَا ۡ﴾ ''انہوں نے کہا کہ ہمیں خوب معلوم ہے کون کون اس میں ہے۔''

﴿لَنُنَجِّيَنَّهٗ وَاَهْلَهٗٓ اِلَّا امْرَاَتَهٗ ۡ كَانَتْ مِنَ الْغٰبِرِيْنَ ۝۳۲﴾ ''ہم ضرور بچالیں گے اُسے بھی اور اُس کے گھر والوں کو بھی، سوائے اُس کی بیوی کے جو پیچھے رہ جانے والوں میں ہوگی۔''

**آیت ۳۳** ﴿وَلَمَّآ اَنْ جَآءَتْ رُسُلُنَا لُوْطًا سِيْۗءَ بِهِمْ وَضَاقَ بِهِمْ ذَرْعًا﴾ ''اور جب ہمارے فرستادے لوطؑ کے پاس پہنچے تو وہ اُن کی وجہ سے بہت پریشان اور دل تنگ ہوا''

حضرت لوط علیہ السلام کی پریشانی کی اصل وجہ یہ تھی کہ فرشتے خوبصورت لڑکوں کے روپ میں وارد ہوئے تھے اور حضرت لوط علیہ السلام اپنی قوم کے اخلاق و کردار سے واقف تھے۔

﴿وَّقَالُوْا لَا تَخَفْ وَلَا تَحْزَنْ ڰ اِنَّا مُنَجُّوْكَ وَاَهْلَكَ﴾ ''انہوں نے کہا کہ آپؑ خوف نہ کھائیں اور نہ آپؑ رنجیدہ ہوں، ہم تو نجات دینے والے ہیں آپؑ کو بھی اور آپؑ کے اہلِ خانہ کو بھی،''

﴿اِلَّا امْرَاَتَكَ كَانَتْ مِنَ الْغٰبِرِيْنَ ۝۳۳﴾ ''سوائے آپؑ کی بیوی کے، وہ ہوگی پیچھے رہ جانے والوں میں سے۔''

**آیت ۳۴** ﴿اِنَّا مُنْزِلُوْنَ عَلٰٓي اَهْلِ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ رِجْزًا مِّنَ السَّمَاۗءِ بِمَا كَانُوْا



يَفْسُقُوْنَ ۝۳۴﴾ ''ہم نازل کرنے والے ہیں اس بستی والوں پر ایک عذاب آسمان سے بسبب اس فسق و فجور کے جو وہ کر رہے تھے۔''

**آیت ۳۵** ﴿وَلَقَدْ تَّرَكْنَا مِنْهَآ اٰيَةًۢ بَيِّنَةً لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۝۳۵﴾ ''اور ہم نے چھوڑ دی اس (بستی) میں سے ایک واضح نشانی ان لوگوں کے لیے جو عقل رکھتے ہیں۔''

قومِ لوط کی بستی کے کھنڈرات قریش کی تجارتی شاہراہ پر موجود تھے، لہٰذا قرآن میں اہلِ مکہ کو بار بار مخاطب کر کے یاد دلایا گیا ہے کہ تم لوگ ان عذاب زدہ بستیوں کے کھنڈرات پر سے گزرتے ہو اور پھر بھی عبرت حاصل نہیں کرتے ہو! اس کے علاوہ بحیرۂ مردار (جسے بحرِ لوط بھی کہا جاتا ہے) بھی قومِ لوط کی بربادی کی کھلی نشانی ہے۔

**آیت ۳۶** ﴿وَاِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا ۙ﴾ ''اور مدین کی طرف بھیجا ہم نے اُن کے بھائی شعیبؑ کو،''

﴿فَقَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَارْجُوا الْيَوْمَ الْاٰخِرَ﴾ ''تو اس نے کہا کہ اے میری قوم کے لوگو! اللہ کی بندگی کرو اور آخرت کے دن کی امید رکھو،''

﴿وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ۝۳۶﴾ ''اور زمین میں فساد مت مچاتے پھرو۔''

**آیت ۳۷** ﴿فَكَذَّبُوْهُ فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ۝۳۷﴾ ''تو انہوں نے اسے جھٹلا دیا، چنانچہ انہیں آ پکڑا زلزلے نے، تو وہ رہ گئے اپنے گھروں کے اندر اوندھے گرے ہوئے۔''

**آیت ۳۸** ﴿وَعَادًا وَّثَمُوْدَا وَقَدْ تَّبَيَّنَ لَكُمْ مِّنْ مَّسٰكِنِهِمْ ۡ﴾ ''اور عاد اور ثمود (کو بھی ہم نے ہلاک کیا) اور تم پر واضح ہو چکے ہیں ان کے مساکن۔''

تمہیں سب معلوم ہے کہ یہ قومیں کس کس علاقے میں کہاں کہاں آباد تھیں۔

﴿وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ﴾ ''اور شیطان نے مزین کر دیے تھے ان کے لیے ان کے (بُرے) اعمال''

شیطان کے زیرِ اثر انہیں اپنے مشرکانہ افعال و اعمال بہت خوش نما لگتے تھے اور یہی وجہ تھی کہ وہ ان ہی میں مگن رہتے تھے۔

﴿فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ وَكَانُوْا مُسْتَبْصِرِيْنَ ۝۳۸﴾ ''اور اس (شیطان) نے

روک دیا تھا انہیں سیدھے راستے سے‘ حالانکہ وہ بہت سمجھ بوجھ والے تھے۔‘‘

**استبصار** باب ’’استفعال‘‘ سے ہے۔اس کے معنی بغور دیکھنا کے ہیں۔مطلب یہ کہ وہ لوگ بڑے باریک بین تھے‘ ہر چیز کا مشاہدہ بڑی احتیاط سے کرتے تھے‘ بڑے ہوشیار اور دانشور قسم کے لوگ تھے‘ مگر اس کے باوجود انہیں راہِ راست سجھائی نہیں دیتی تھی۔ یہ تضاد اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ بہت سمجھدار انسان اپنی ناک کے نیچے کے پتھر سے ٹھوکر کھا جاتا ہے۔آج کے سائنسدانوں ہی کی مثال لے لیجیے۔آج یہ لوگ کیسی کیسی ایجادات کر رہے ہیں۔کائنات کے کیسے کیسے حقائق تک آج ان کی رسائی ہے۔اربوں‘ کھربوں نوری سالوں کی دوری پر نئے نئے ستاروں کو دریافت کر رہے ہیں۔ کیسے کیسے آلات کی مدد انہیں حاصل ہے اور ان آلات کے ذریعے کیسے کیسے مشاہدات ان کی نظروں سے گزرتے ہیں۔لیکن اس سب کچھ کے باوجود ان کے ذہن خالقِ کائنات اور مدبّرِ کائنات کی طرف منتقل نہیں ہوتے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ یہ سب کچھ ایک (مادی) آنکھ سے دیکھ رہے ہیں جبکہ ان کی دوسری (روحانی) آنکھ بالکل اندھی ہے۔ایسے ہی سائنسدانوں اور دانشوروں کے بارے میں اقبالؔ نے کہا تھا:

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا
اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا!

یعنی یہ لوگ کائنات کے بڑے بڑے رازوں کی کھوج میں تو لگے ہوئے ہیں اور تحقیق کے اس میدان میں آئے روز نت نئی کامیابیوں کے جھنڈے بھی گاڑ رہے ہیں‘ لیکن ان میں سے کوئی اپنی ذات کے بارے میں جاننے کی زحمت گوارا نہیں کرتا کہ میں کون ہوں؟ کہاں سے آیا ہوں؟ مجھے کہاں جانا ہے؟ میری اس زندگی کا مقصد و مآل کیا ہے؟ ان کے نزدیک تو زندگی بھی جانوروں کی طرح پیدا ہونے‘ کھانے پینے‘ نسل بڑھانے اور مر جانے کا نام ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ موت پر انسانی زندگی کا خاتمہ ہو جائے گا۔اگر انسانی زندگی ان دانشوروں کے خیال میں یہی کچھ ہے تو پھر یہ واقعی ایک کھیل ہے۔اور کھیل بھی بقول بہادر شاہ ظفر بس چار دن کا!

عمرِ دراز مانگ کے لائے تھے چار دن
دو آرزو میں کٹ گئے‘ دو انتظار میں!

اس ’’دانشورانہ‘‘ نقطۂ نظر کے مطابق جائزہ لیں تو انسانی زندگی کی تہی دامانی اور بے بضاعتی پر ترس آتا ہے۔ماہ و سال کے اس میزانیہ میں سے کچھ وقت تو بچپنے کے بھولپن میں بیت گیا‘ کچھ لڑکپن کے کھیل کود اور شرارتوں میں۔جوانی آئی تو سنجیدہ سوچ کی گویا بساط ہی الٹ



گئی۔جوانی کا خمار اترا اور ہوش سنبھالنے کی فرصت محسوس ہوئی تو بڑھاپے کی چاپ سنائی دینے لگی۔اور اگر کوئی زیادہ سخت جان ثابت ہوا تو اسے ’’ارذل العمر‘‘ میں **لِكَيْ لَا يَعْلَمَ بَعْدَ عِلْمٍ شَيْئًا** ☆ کے نوشتہ تقدیر کا سامنا کرنا پڑا —— تو کیا یہی ہے انسان کی اس ’’انمول‘‘ زندگی کی حقیقت؟ کیا اسی کے بل پر انسان اشرف المخلوقات بنا تھا؟ اور کیا اسی برتے پر یہ مسجودِ ملائک ٹھہرا تھا؟ اور کیا: ع ’’اِک ذرا ہوش میں آنے کے خطاکار ہیں ہم؟‘‘ —— نہیں‘ نہیں‘ ایسا ہرگز نہیں! انسانی زندگی اتنی ارزاں کیونکر ہو سکتی ہے؟ انسانی زندگی فقط پیدا ہونے‘ کھانے پینے اور چند سال زندہ رہنے کے دورانیے تک ہرگز محدود نہیں ہو سکتی! بلکہ یہ اس تصور سے بہت اعلیٰ اور بہت بالا ایک ابدی حقیقت ہے۔بقول اقبالؔ:

تُو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ
جاوداں‘ پیہم دواں‘ ہر دم جواں ہے زندگی!

دراصل جس ’’دورانیے‘‘ کو یہ لوگ زندگی سمجھے بیٹھے ہیں وہ تو اصل زندگی کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں۔انسانی زندگی کا اصل اور بڑا حصہ تو وہ ہے جس کا آغاز انسان کی موت کے بعد ہونے والا ہے۔اس دنیا کی زندگی تو انسان کے لیے محض ایک وقفہ امتحان ہے اور بس!

**آیت ۳۹** ﴿وَقَارُوْنَ وَفِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ ۫﴾ ’’اور (اسی طرح ہلاک کیا ہم نے) قارون‘ فرعون اور ہامان کو بھی۔‘‘

﴿وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مُّوْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ﴾ ’’اور ان کے پاس آئے تھے موسیٰؑ واضح نشانیاں لے کر‘‘

﴿فَاسْتَكْبَرُوْا فِي الْاَرْضِ وَمَا كَانُوْا سَابِقِيْنَ ۝۳۹﴾ ’’تو انہوں نے زمین میں تکبّر کیا‘ لیکن وہ ہماری پکڑ سے بچ کر نکل جانے والے نہیں تھے۔‘‘

**آیت ۴۰** ﴿فَكُلًّا اَخَذْنَا بِذَنْۢبِهٖ ۚ﴾ ’’چنانچہ ہم نے ان میں سے ہر ایک کو اُس کے گناہ کی پاداش میں پکڑا۔‘‘

﴿فَمِنْهُمْ مَّنْ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِ حَاصِبًا ۚ﴾ ’’تو ان میں وہ بھی تھے جن پر ہم نے زوردار آندھی بھیجی۔‘‘

---

☆ ’’تاکہ کچھ بھی نہ جان سکے وہ‘ جان لینے کے بعد!‘‘ (النحل:۷۰)

یہ آندھی قومِ لوطؑ پر بھی آئی تھی جو زلزلے سے تلپٹ ہو جانے والی بستیوں پر پتھراؤ کرنے کے لیے بھیجی گئی تھی۔ اس سے پہلے قومِ عاد پر بھی آندھی کا عذاب آیا تھا' جس کا ذکر سورۃ الحاقہ میں اس طرح آیا ہے: ﴿وَاَمَّا عَادٌ فَاُهْلِكُوْا بِرِيْحٍ صَرْصَرٍ عَاتِيَةٍ ۝۶ سَخَّرَهَا عَلَيْهِمْ سَبْعَ لَيَالٍ وَّثَمٰنِيَةَ اَيَّامٍ ۙ حُسُوْمًا فَتَرَى الْقَوْمَ فِيْهَا صَرْعٰى ۙ كَاَنَّهُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ خَاوِيَةٍ ۝۷﴾ ''اور قومِ عاد کے لوگ ہلاک کیے گئے تیز آندھی سے' جو ان پر مسلّط کر دی گئی سات راتیں اور آٹھ دن تک' برباد کر دینے کے لیے' پس تو دیکھتا ان لوگوں کو جو گری ہوئی کھجوروں کے تنوں کی طرح پچھڑے پڑے تھے''۔ روایات میں آتا ہے کہ اس ہوا میں کنکر اور پتھر بھی تھے جو گولیوں اور میزائلوں کی طرح انہیں نشانہ بناتے تھے اور وہ آندھی اتنی زوردار تھی کہ انسانوں کو پٹخ پٹخ کر زمین پر پھینکتی تھی۔

﴿وَمِنْهُمْ مَّنْ اَخَذَتْهُ الصَّيْحَةُ ۚ﴾ ''اور ان میں وہ بھی تھے جنہیں چنگھاڑ نے آپکڑا۔''

اس سے قومِ ثمود کے لوگ اور اہلِ مدین مراد ہیں۔

﴿وَمِنْهُمْ مَّنْ خَسَفْنَا بِهِ الْاَرْضَ ۚ﴾ ''اور ان میں وہ بھی تھے جنہیں ہم نے زمین میں دھنسا دیا۔''

اس ضمن میں قارون کا ذکر سورۃ القصص میں گزر چکا ہے۔

﴿وَمِنْهُمْ مَّنْ اَغْرَقْنَا ۚ﴾ ''اور وہ بھی تھے جن کو ہم نے غرق کر دیا۔''

غرق کیے جانے کا عذاب دو قوموں پر علیحدہ علیحدہ طریقے سے آیا تھا۔ قومِ نوحؑ کو تو ان کے گھروں اور شہروں میں ہی غرق کر دیا گیا تھا' جبکہ فرعون اور اس کے لاؤ لشکر کو محلوں اور آبادیوں سے نکال کر سمندر میں لے جا کر غرق کیا گیا۔

﴿وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ۝۴۰﴾ ''اور اللہ ایسا نہیں تھا کہ ان پر ظلم کرتا' بلکہ وہ لوگ خود ہی اپنی جانوں پر ظلم کرتے تھے۔''

**آیت ۴۱** ﴿مَثَلُ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْلِيَآءَ كَمَثَلِ الْعَنْكَبُوْتِ ۚ اِتَّخَذَتْ بَيْتًا ۭ﴾ ''ان لوگوں کی مثال جنہوں نے اللہ کے سوا کچھ حمایتی بنا رکھے ہیں ایسی ہے جیسے مکڑی کی مثال' جس نے ایک گھر بنایا۔''



اس تمثیل کے اعتبار سے یہ آیت سورت کے اس حصے کی بہت اہم آیت ہے۔ اس تمثیل میں اللہ کے سوا جن مددگاروں کا ذکر ہوا ہے وہ غیر مرئی بھی ہو سکتے ہیں' جیسے کوئی کہے کہ مجھے فلاں دیوی کی کرپا چاہیے یا کوئی کسی ولی اللہ کی نظرِ کرم کے سہارے کی بات کرے۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ظاہری و معنوی طاقت یا مادی وسائل کی بنیاد پر کوئی شخص کسی فرد' قوم یا چیز پر ایسا بھروسا کرے کہ وہ اللہ کے اختیار اور اس کی قدرت کو بھلا بیٹھے۔ جیسے ہم امریکہ کو اپنا پشت پناہ سمجھ کر اُس کی جھولی میں جا بیٹھتے ہیں۔ آیت زیرِ نظر میں ایسے تمام سہاروں کو مکڑی کے جالے سے تشبیہہ دے کر یہ حقیقت یاد دلائی گئی ہے کہ اصل اختیار اور قدرت و طاقت کا مالک اللہ ہے۔ اس کے سہارے اور اس کے توکّل کو چھوڑ کر کسی اور کا سہارا ڈھونڈنا گویا مکڑی کے گھر میں پناہ لینے کے مترادف ہے۔

﴿وَاِنَّ اَوْهَنَ الْبُيُوْتِ لَبَيْتُ الْعَنْكَبُوْتِ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۝۴۱﴾ ''بے شک تمام گھروں میں سب سے زیادہ کمزور گھر مکڑی ہی کا گھر ہے۔ کاش کہ انہیں معلوم ہوتا!''

**آیت ۴۲** ﴿اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَيْءٍ ۭ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝۴۲﴾ ''یقیناً اللہ خوب جانتا ہے جس چیز کو بھی یہ لوگ اُس کے سوا پکارتے ہیں۔ اور وہ زبردست ہے' حکمت والا۔''

**آیت ۴۳** ﴿وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ ۚ وَمَا يَعْقِلُهَآ اِلَّا الْعٰلِمُوْنَ ۝۴۳﴾ ''اور یہ مثالیں ہم بیان کرتے ہیں لوگوں کے لیے' لیکن انہیں نہیں سمجھتے مگر وہی لوگ جو علم والے ہیں۔''

**آیت ۴۴** ﴿خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۝۴۴﴾ ''اللہ نے تخلیق کیا آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ۔ یقیناً اس میں عظیم نشانی ہے ایمان والوں کے لیے۔''

❁❁❁

# اصلاحِ معاشرہ کا انقلابی تصور (۲)

بانیٔ تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمدؒ

کا ۱۲/ نومبر ۱۹۸۲ء کا خطاب

(گزشتہ سے پیوستہ)

## بعثتِ محمد ﷺ کی تکمیلی شان

آگے بڑھنے سے پہلے میں ایک بات کی وضاحت کرنا چاہوں گا کہ اظْهَارُ دِيْنِ الْحَقِّ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ نبی اکرم ﷺ کی بعثت کا تکمیلی مرحلہ ہے اور یہ وہ منصب ہے جو آنحضور ﷺ کے سوا کسی نبی یا رسول کو فرضِ منصبی کے طور پر عطا نہیں ہوا۔ گویا اس مقدس جماعت کی ذمہ داری یہ تھی کہ وہ نظامِ عدل وقسط کے قیام کی سعی اور جدّوجُہد کرے‘ لیکن اس کام کو تکمیلی شان تک پہنچانا بذاتِ خود نبی اکرم ﷺ کا منصب قرار دیا گیا اور پھر آنحضور ﷺ نے اپنی حیاتِ طیبہ میں جزیرہ نمائے عرب کی حد تک اظْهَارُ دِيْنِ الْحَقِّ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ کے حکم کی تعمیل فرمادی۔

ویسے تو تمام انبیاء ورسل علیہم السلام کی طرح نبی اکرم ﷺ شاہد بھی تھے اور شہید بھی‘ مبشّر بھی تھے اور نذیر بھی‘ داعی الی الخیر بھی تھے اور مبلّغ بھی‘ مذکّر بھی تھے اور واعظ بھی‘ مربّی بھی تھے اور مزکّی بھی‘ معلّم بھی تھے اور مدرّس بھی‘ رحمت بھی تھے اور رأفت بھی ــــ الغرض یہ جملہ شانیں بھی بتمام وکمال نبی آخرالزماں حضرت محمد ﷺ میں موجود تھیں‘ لیکن آنحضور ﷺ کی امتیازی شان اظْهَارُ دِيْنِ الْحَقِّ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ہے اور آپ ﷺ نے تیئیس (۲۳) سالہ جان گسل محنت ومشقت جھیل کر اس دینِ حق اور نظامِ عدل وقسط کو جزیرہ نمائے عرب میں بالفعل قائم فرما دیا اور اس طرح امرِ الٰہی ﴿اُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ﴾ کی کلی طور پر تعمیل فرمادی۔

اس موقع پر یہ بات ذہن میں رکھیے کہ آنحضور ﷺ اور آپؐ کے صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے یہ نظام ’’حدید‘‘ کی قوت سے قائم کیا۔ اسی لیے مدینۃ النبیؐ میں تمکّن کے بعد آپ ﷺ اور صحابہ کرامؓ کی زندگیوں میں ’’غزوات‘‘ کا ذکر کثرت سے ملتا ہے۔ محض دعوت و تبلیغ سے نظامِ عدل وقسط کبھی قائم نہیں ہوسکتا۔ اگر ہوسکتا ہوتا تو حضرت محمدؐ رسول اللہ ﷺ قائم کر کے دکھاتے‘ لیکن تاریخ انسانی میں اس کی کوئی مثال موجود نہیں ہے کہ محض دعوت وتبلیغ سے کوئی نظام بنیاد سے لے کر چوٹی تک تبدیل ہوجائے۔ انقلابات محض وعظ ونصیحت سے نہیں آیا کرتے‘ بلکہ اس کے لیے انقلابی جدوجہد ناگزیر ہے‘ جس میں صبر و مصابرت (passive resistance) سے لے کر اقدام (active resistance) اور مسلح تصادم (armed conflict) کے تمام مراحل سے گزرنا لازم اور لابدمنہ ہے۔ دعوت وتبلیغ اور وعظ و نصیحت سے چند لوگوں کی سیرت واخلاق تو درست ہوسکتے ہیں اور ان کی انفرادی زندگیوں میں تھوڑا سا نکھار آ سکتا ہے‘ لیکن نظامِ عدل وقسط قائم نہیں ہوسکتا۔

## نفاذِ نظامِ عدل میں رکاوٹ کون؟

جب بھی کسی معاشرے میں نظامِ عدل وقسط کے قیام کے لیے جدوجہد کا آغاز ہوتا ہے تو اس راستے میں ان طبقات کی طرف سے شدید ترین مزاحمت ہوتی ہے جن کا شمار haves میں ہوتا ہے۔ یہ وہ مراعات یافتہ طبقات (privileged classes) ہیں‘ جنہوں نے لوگوں کا خون چوسا ہوتا ہے اور چوس رہے ہوتے ہیں اور جن کے مفادات (vested interests) رائج ظالمانہ اور غیر عادلانہ نظام سے وابستہ ہوتے ہیں۔ یہ لوگ کبھی اس کو گوارا نہیں کر سکتے کہ نظامِ عدل وقسط قائم ہو۔ اسی لیے رسول اللہ ﷺ سے فرمایا گیا کہ آپ اس نظام کے نفاذ میں کافروں اور مشرکوں کی ناگواری کا خیال مت کیجیے: ﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۙ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ﴿٣٣﴾﴾ (التوبۃ) ’’وہی تو ہے جس نے بھیجا اپنے رسول (ﷺ) کو الہدیٰ اور دینِ حق دے کر تا کہ غالب کردے اسے کُل کے کُل دین (نظامِ زندگی) پر‘ خواہ یہ مشرکوں کو کتنا ہی ناگوار گزرے‘‘۔ سورۃ الشوریٰ میں فرمایا گیا: ﴿اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ۭ كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِيْنَ مَا تَدْعُوْهُمْ اِلَيْهِ ۭ﴾ (آیت ۱۳) ’’قائم کرو دین کو اور اس میں تفرقہ نہ ڈالو۔ (اے نبی ﷺ) بہت بھاری ہے مشرکین پر یہ بات جس کی طرف آپ ان کو بلا رہے ہیں‘‘۔ یعنی مشرکین کی ناگواری اور ان کی مزاحمت ومخالفت

کے علی الرغم نظامِ عدل وقسط اور دینِ حق کے قیام کے لیے آپ کو جدوجہد کرنی ہے‘ اور اس کام کے لیے آپ کو ’’حدید‘‘ کی قوت عطا کی گئی اور جنگ وقتال کو فرض قرار دیا گیا:

﴿کُتِبَ عَلَیۡکُمُ الۡقِتَالُ وَہُوَ کُرۡہٌ لَّکُمۡ ۚ وَعَسٰۤی اَنۡ تَکۡرَہُوۡا شَیۡئًا وَّہُوَ خَیۡرٌ لَّکُمۡ ۚ وَعَسٰۤی اَنۡ تُحِبُّوۡا شَیۡئًا وَّہُوَ شَرٌّ لَّکُمۡ ؕ﴾ (البقرۃ:۲۱۶)

’’(مسلمانو!) اب تم پر جنگ فرض کر دی گئی ہے اور وہ تمہیں گراں گزر رہی ہے۔ اور ہو سکتا ہے کہ تم کسی شے کو ناپسند کرو اور وہ تمہارے لیے بہتر ہو۔ اور ہو سکتا ہے کہ تم کسی چیز کو پسند کرو درآنحالیکہ وہی تمہارے لیے بری ہو۔‘‘

پھر اس قتال فی سبیل اللہ اور قیامِ نظامِ عدل وقسط کی خاطر قتال کی اہمیت کے بارے میں سورۃ الصف میں فرمادیا گیا: ﴿اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الَّذِیۡنَ یُقَاتِلُوۡنَ فِیۡ سَبِیۡلِہٖ صَفًّا کَاَنَّہُمۡ بُنۡیَانٌ مَّرۡصُوۡصٌ ﴿۴﴾﴾ ’’اللہ کو تو محبوب ہیں وہ بندے جو اُس کی راہ میں صفیں باندھ کر قتال کرتے ہیں‘ جیسے کہ وہ سیسہ پلائی دیوار ہوں‘‘ اور سورۃ المائدۃ میں فرمایا گیا: ﴿اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الۡمُقۡسِطِیۡنَ ﴿۴۲﴾﴾ ’’یقیناً اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔‘‘

## نظامِ عدل وقسط کی اہمیت اور اس کی برکات

جنابِ محمدٌ رسول اللہ ﷺ نے یہ نظامِ عدل وقسط قائم کر کے دکھایا ہے جس کی برکات سیرتِ مطہرہ اور تاریخ کے مطالعہ سے روزِ روشن کی طرح ہمارے سامنے آتی ہیں کہ کس طرح سماجی اونچ نیچ ختم ہوئی‘ کس طرح تمام بنی نوعِ انسان ایک سطح پر آ گئے اور اس فرمانِ رسول کا مکمل نقشہ چشمِ فلک نے دیکھا: ((کُوْنُوْا عِبَادَ اللّٰہِ اِخْوَانًا))(۱)۔ مزید یہ کہ حضور ﷺ کے اس ارشاد کی عملی تصویر نوعِ انسانی نے دنیا میں اجتماعی طور پر پہلی بار دیکھی:

((یَا اَیُّھَا النَّاسُ! اَلَا اِنَّ رَبَّکُمْ وَاحِدٌ وَاِنَّ اَبَاکُمْ وَاحِدٌ ، اَلَا لَا فَضْلَ لِعَرَبِیٍّ عَلٰی اَعْجَمِیٍّ، وَلَا لِعَجَمِیٍّ عَلٰی عَرَبِیٍّ، وَلَا لِاَحْمَرَ عَلٰی اَسْوَدَ، وَلَا اَسْوَدَ عَلٰی اَحْمَرَ ، اِلَّا بِالتَّقْوٰی))(۲)

(۱) صحیح البخاری‘ کتاب الادب‘ باب ما ینھی عن التحاسد والتدابر۔ وصحیح مسلم‘ کتاب البر والصلۃ والآداب‘ باب تحریم التحاسد والتباغض والتدابر۔

(۲) مسند احمد‘ ح ۲۲۹۷۸‘ شعب الایمان للبیھقی ۴/۱۸۲۰۔ صحیح الترغیب للالبانی‘ ح ۲۹۶۴۔ راوی: جابر بن عبد اللّٰہ الانصاری ؓ۔



’’لوگو! آگاہ ہو جاؤ‘ یقیناً تمہارا ربّ ایک ہے اور تمہارا باپ بھی ایک ہے۔ خبردار! نہ کسی عربی کو کسی عجمی پر کوئی فضیلت حاصل ہے اور نہ کسی عجمی کو کسی عربی پر‘ اور نہ کسی سرخ وسفید رنگت والے کو کسی سیاہ فام پر کوئی فضیلت حاصل ہے اور نہ کسی سیاہ فام کو کسی سرخ وسفید رنگت والے پر‘ مگر تقویٰ کے لحاظ سے۔‘‘

بقول علامہ اقبال مرحوم ؎ ’’تمیز بندہ وآقا فسادِ آدمیت ہے‘‘ —— اور

کُلُّ مُؤْمِنٍ اِخْوَۃٌ اندر دلش — حریت سرمایۂ آب و گلش
ناشکیبِ امتیازات آمدہ — در نہادِ او مساوات آمدہ

یہ مساواتِ سماجی مساوات ہے‘ اس کو جناب محمدٌ رسول اللہ ﷺ نے قائم کیا ہے اور اس شان سے قائم کیا ہے کہ جب بنی مخزوم کی ایک سارقہ —— جس پر قطع ید کی سزا کے نفاذ کا حضور ﷺ فیصلہ فرما چکے تھے —— کے لیے آپؐ کے پاس سفارشات پہنچیں تو آنحضور ﷺ نے فرمایا: ((وَالَّذِیْ نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِیَدِہٖ لَوْ اَنَّ فَاطِمَۃَ بِنْتَ مُحَمَّدٍ سَرَقَتْ لَقَطَعْتُ یَدَھَا))(۳) ’’اللہ کی قسم جس کے ہاتھ میں محمد (ﷺ) کی جان ہے‘ اگر محمدؐ کی بیٹی فاطمہ بھی چوری کرتی تو میں اُس کا ہاتھ بھی لازماً کاٹتا۔‘‘

رسول اللہ ﷺ نے کیسا نظام برپا کیا تھا‘ اس کے بارے میں جاننے کے لیے بیعتِ خلافت کے بعد حضرت ابوبکر صدیق ؓ کے پہلے خطبے کے اس ارشاد کو ذہنوں میں تازہ کیجیے: ’’لوگو! تم میں سے ہر قوی شخص میرے نزدیک بہت کمزور ہو گا جب تک کہ میں اس سے کسی کا حق وصول نہ کر لوں اور تم میں سے ہر کمزور شخص میرے نزدیک بہت قوی ہو گا جب تک کہ میں اُسے اس کا حق نہ دلوا دوں‘‘۔ یہ ارشاد درحقیقت تدبیر مملکت پر مبنی وہ بیان (policy statement) ہے جو خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کی غرض وغایت کو واضح کر رہا ہے۔ پھر حضرت عمر فاروق ؓ کا وہ تاریخی جملہ یاد کیجیے کہ آپؓ کو خوف ہے کہ ’’اگر دریائے فرات کے کنارے کوئی کُتا بھی بھوک سے مر گیا تو آخرت میں مجھ سے مواخذہ نہ ہو جائے!‘‘ اُمت کے دو گلہائے سرسبد کے احساسات وتاثرات میں یہ شدت اس لیے تھی کہ نبی اکرم ﷺ کو نظامِ عدل وقسط قائم کرنے کا حکم دیا گیا تھا: ﴿وَاُمِرۡتُ لِاَعۡدِلَ بَیۡنَکُمۡ ؕ﴾ (الشوریٰ:۱۵) اور آپ ﷺ کی بعثت کا امتیازی وتکمیلی

(۳) صحیح البخاری‘ کتاب المغازی‘ باب منہ۔

مقصد اِظھارُ دِیْنِ الْحَقِّ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّہٖ'' تھا۔ خلافت راشدہ درحقیقت نبوتِ محمدی ﷺ کا تسلسل اور تتمہ وتکملہ تھی' اسی لیے اُسے خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کہا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خلفائے راشدین کے احساسات بھی نظامِ عدل وقسط کے حوالے سے بہت شدید تھے۔

اس ضمن میں حضرت ربعی بن عامر رضی اللہ عنہ کے وہ الفاظ بھی بہت اہم ہیں جو آپؓ نے ایرانی افواج کے سپہ سالار رستم کو مخاطب کرتے ہوئے کہے تھے۔ قادسیہ کے محاذ پر اسلامی افواج کے سپہ سالار حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے جنگ سے پہلے ایرانیوں کے ساتھ مذاکرات کے لیے حضرت ربعی بن عامر رضی اللہ عنہ کو بھیجا تھا۔ رستم نے ان سے سوال کیا تھا کہ تم لوگ یہاں کیا لینے آئے ہو؟ اس پر انہوں نے اپنے مشن کی وضاحت ان الفاظ میں کی تھی:

**اِنَّ اللّٰہ ابتعثنا لنخرج العباد من عبادۃ العباد الی عبادۃ ربِّ العباد' ومن ضیق الدُّنیا الی سِعَۃ الآخرۃ ومن جور الادیان الی عدل الاسلام**

''ہمیں اللہ نے بھیجا ہے تاکہ ہم بندوں کو بندوں کی غلامی سے نکال کر بندوں کے رب کی غلامی میں لے آئیں' اور انہیں دنیا کی تنگی سے نکال کر آخرت کی کشادگی سے ہم کنار کریں' اور باطل نظاموں سے نجات دلا کر اسلام کے عادلانہ نظام سے روشناس کرائیں۔''

## اصلاحِ معاشرہ اور نظامِ عدل وقسط کا باہمی تعلق

یہ بات ذہن نشین کرنا ضروری ہے کہ قرآن مجید کے نزدیک نظامِ عدل وقسط کے قیام کی اہمیت کیا ہے۔ اس کا میرے آج کے موضوع سے جو تعلق ہے اُسے پھر ذہن میں تازہ کر لیجیے کہ اصلاحِ معاشرہ کی کوئی کوشش اُس معاشرے میں بارآور نہیں ہوسکتی جس میں ظلم' ناانصافی اور عدوان کا دور دورہ ہوگا۔ اس لیے کہ یہ تو بے چینی کو جنم دینے والے عوامل (factors) ہیں اور ان سے لوگوں کی ایک عظیم اکثریت ڈھور ڈنگروں کی سطح تک گرا دی جاتی ہے۔ اس کے نتیجے میں حساس لوگوں میں انتقام کی آگ بھڑکتی ہے' ان کے جذبات مشتعل ہوتے ہیں اور ان کے دل انتقام کی آگ کی بھٹیاں بن جاتے ہیں۔

اگر کسی معاشرہ میں معاشی عدم وتفاوت اور ناانصافی پر مبنی ایسا نظام رائج ہوگا تو پھر وہاں دو ہی صورتیں ہوسکتی ہیں: یا تو بے حسی اتنی غالب ہو جائے گی کہ لوگ ڈھور ڈنگر بن جائیں گے یا اس کا ردِّعمل یہ ہوگا کہ حسّاس لوگ باغی اور منتقم بن کر اقتدارِ وقت اور استحصالی طبقات کے خلاف



اٹھ کھڑے ہوں گے اور آتش وخون کے دریا بہیں گے۔ ظالمانہ اور استحصالی نظام میں وہ فضا کسی صورت پیدا نہیں ہوسکتی جو خیر' بھلائی' مثبت کردار اور تعمیرِ سیرت واخلاق کے لیے سازگار ہو۔

اس موقع پر میں علامہ اقبال کے وہ اشعار آپ کو سنا دینا ضروری سمجھتا ہوں جن کے بارے میں آج میرے دل میں ایک عجیب احساس جاگا۔ وہ یہ کہ جیسے امام شافعیؒ نے سورۃ العصر کے بارے میں فرمایا تھا: لَوْ لَمْ یُنَزَّلْ مِنَ الْقُرْآنِ سِوَاھَا لَکَفَتِ النَّاسَ ''اگر قرآن مجید میں اس سورۂ مبارکہ کے سوا اور کچھ بھی نازل نہ ہوتا تو صرف یہ سورت ہی لوگوں (کی ہدایت) کے لیے کافی ہوتی''—— میں بلاتشبیہ عرض کر رہا ہوں کہ اگر علامہ اقبال کا کوئی کلام نہ ہوتا سوائے ان اشعار کے تو یہ اشعار ان کی عظمت کا لوہا تسلیم کرانے کے لیے کافی ہوتے۔ ان اشعار میں علامہ کے فکر کی بلندی انتہا تک پہنچی ہوئی نظر آتی ہے اور ہمارے سامنے یہ حقیقت عیاں ہو جاتی ہے کہ پیرِ رومی کا یہ مریدِ ہندی آیاتِ قرآنیہ اور ان کے مطالب ومفاہیم کو کس آب وتاب اور شان سے اپنے اشعار میں بیان کر رہا ہے۔ علامہ فرماتے ہیں: ؎

چیست قرآں ' خواجہ را پیغامِ مرگ
دستگیرِ بندۂ بے ساز و برگ
ہیچ خیر از مردکِ زرکش مجو
لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا

اس شعر کا دوسرا مصرع قرآنی آیت کے الفاظ پر مشتمل ہے—— ان اشعار میں علامہ نے یہ پیغام دیا ہے کہ جانتے ہو قرآن کی حقیقت کیا ہے؟ یہ سرمایہ دار کے لیے موت کا پیغام اور بے سروسامان لوگوں کے لیے سہارا وآسرا ہے۔ زراندوزی کرنے والے اور مال سے محبت کرنے والے بندے سے کسی خیر کی توقع نہ کرو۔ (چاہے اس کے پاس حج اور عمروں کے انبار موجود ہوں' چاہے تہجدوں کی کثرت ہو' چاہے کتنی ہی مفروضہ اور نفلی عبادات ہوں۔) اس لیے کہ قرآن کا فتویٰ یہ ہے: ﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ؕ﴾ (آلِ عمران:۹۲) ''تم ہرگز نہیں پہنچ سکتے نیکی کے مقام کو جب تک کہ خرچ نہ کرو اس میں سے جو تمہیں پسند ہے۔''

## اصلاحِ معاشرہ کے لیے معاشی ناانصافی کا خاتمہ ضروری ہے

علامہ اقبال نے ہمارے رائج الوقت نظامِ حیات کے معاشی پہلو پر شدید تنقید کی ہے

—— ہمارے نظامِ معیشت کے دوستون ہیں: ایک کاروبار یا صنعت وحرفت‘ دوسرا مزارعت۔ ان دونوں کی بنیاد میں ربا (سود) رچا بسا ہوا ہے۔ مزارعت کی رائج الوقت صورت کو جناب محمدؐ رسول اللہ ﷺ نے ربا قرار دیا ہے۔ آپ ﷺ نے مزارعت کا معاملہ کرنے والوں سے فرمایا: ((قَدْ اَرْبَیْتُمَا، فَرُدَّ الْاَرْضَ اِلٰی اَھْلِھَا وَخُذْ نَفَقَتَكَ))(۴) ’’تم لوگوں نے ربا کا معاملہ کیا ہے‘ تم زمین اس کے مالکوں کو واپس کردو اور اپنا خرچہ لے لو‘‘۔ مزارعت کی یہ صورت کہ بٹائی پر زمین زراعت کے لیے دی جائے اور اگر فصل کسی وجہ سے برباد ہوجائے تو مالک زمین کا حبّہ برابر نقصان نہیں ہوگا‘ جبکہ مزارع خالی ہاتھ رہ جائے گا‘ اس کی ساری محنت اکارت جائے گی اور وہ مزید زیربار ہوجائے گا—— مزارعت کی اس قسم کے بارے میں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ قطعیت کے ساتھ کہتے ہیں کہ یہ حرام مطلق ہے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ بھی اسے قطعیت کے ساتھ حرام مطلق قرار دیتے ہیں‘ جبکہ قاضی ابو یوسف‘ امام محمد اور امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہم اس کے جواز کا فتویٰ دیتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ ہے۔

لاہور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس جاوید اقبال صاحب‘ جو علامہ کے فرزند ارجمند ہیں‘ نے حال ہی میں ایک تقریر میں بڑی صحیح بات کہی ہے کہ ہمارے ہاں بھی قانونِ ضرورت و احتیاج (Law of Necessity) کارفرما رہا ہے۔ اس قانون نے جہاں ملوکیت کو سندِ جواز عطا کی ہے وہیں زمینداری اور جاگیرداری کو بھی سندِ جواز عطا کردی ہے۔ اس لیے کہ جب وہ نظام عملاً برپا ہوگیا تو اب کیا کریں؟ جب فوج اقتدار پر قابض ہوگئی تو کون سی سپریم کورٹ ہے جو اس سے اقتدار چھین سکتی ہو! ایسے حالات میں تو نظریۂ ضرورت کے تحت اسے سندِ جواز دینی ہی پڑے گی‘ چاہے اُسے مشروط ہی کیوں نہ کردیا جائے۔ پھر ان شرائط کی پروا آخر کون کرے گا؟ اور اگر کوئی نہ کرے تو کون مائی کا لال ہوگا جو ان شرائط پر عمل درآمد کرنے پر کسی فوجی آمر کو مجبور کرسکے۔(۵) اسی طرح جب جاگیرداری اور زمینداری معاشرے میں عملاً رواج پاگئی تو قاضی ابو یوسفؒ‘ امام محمدؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کیا کریں؟ یہ متاخرین ہیں‘ جبکہ مقدّم الذکر دو حضرات

(۴) سنن ابی داؤد‘ کتاب البیوع‘ باب فی التشدید فی ذالك۔

(۵) ڈاکٹر صاحب کا یہ خطاب ۱۲/ نومبر ۱۹۸۲ء کا ہے۔ اس وقت جنرل ضیاء الحق کا مارشل لاء کا دور تھا‘ جسے سپریم کورٹ نے ’’نظریۂ ضرورت‘‘ کے تحت جائز قرار دے دیا تھا۔ (مرتب)



چوٹی کے لوگ ہیں‘ جن کو اساتذۂ کرام کا مقام حاصل ہے‘ جو امام الائمہ کا رتبہ رکھتے ہیں—— ہمارے ہاں فقہ کا وہ مکتب جو عموماً قیاس ورائے پر مبنی سمجھا جاتا ہے اس کے رجل اعظم یقیناً امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ ہیں اور باقی آنے والے انہی کے خوشہ چین ہیں۔ دوسری طرف حدیث رسول علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام پر مبنی فقہ میں الفضل للمتقدمین کے اعتبار سے اوّلیت واقدمیت امام مالک بن انس رحمۃ اللہ علیہ کے لیے ہے۔ مزید یہ کہ امام مالکؒ امام دارالھجرۃ اور امام مدینۃ الرسول ہیں اور اہلِ مدینہ کا تعامل بھی ہمارے فقہاء کے نزدیک ایک سند کی حیثیت رکھتا ہے—— یہ دونوں امام مزارعت کی حرمت پر متفق ہیں۔ چنانچہ صرف لین دین اور کاروباری سود کو آپ ربا نہ سمجھئے‘ بلکہ علامہ کا وہ شعر‘ جو ابھی میں آپ کو سنانے والا ہوں اس میں جس ربا کا ذکر ہے اس میں رائج الوقت مزارعت کو بھی شامل سمجھئے۔ میں نے شعر سنانے سے قبل اس کی قدرے تفصیل سے شرح کردی ہے۔ علامہ فرماتے ہیں:

از ربا آخر چہ می زاید؟ فتن!
کس نداند لذتِ قرضِ حسن
از ربا جاں تیرہ‘ دل چوں خشت و سنگ
آدمی درّندہ بے دندان و چنگ

’’سود سے سوائے فساد کے اور کس چیز میں اضافہ ہوسکتا ہے؟ افسوس کہ بغیر سود قرض دینے کی لذت کسی کو معلوم نہیں۔ سود سے روح تاریک اور دل اینٹ پتھر کی طرح سخت ہوجاتا ہے اور انسان بغیر دانتوں اور پنجوں کے درندہ بن جاتا ہے۔‘‘

یہاں اس شہر لاہور میں ایک مردِ درویش مولانا احمد علی رحمۃ اللہ علیہ رہے ہیں‘ جن کا ایک کشف میں آپ کو سنانا چاہتا ہوں۔ انہیں یہ کشف ایک دوسرے درویش کے ذریعے سے حاصل ہوا تھا۔ یہ مولانا کا وہ زمانہ ہے جب ان کو انگریزی سامراج نے لاہور میں نظر بند کر رکھا تھا۔ مولانا بتاتے ہیں کہ میں ایک روز کشمیری بازار میں گھوم رہا تھا کہ ایک خستہ حال درویش مجھ سے ملا اور اس نے مجھ سے کہا کہ ’’مجھے کسی انسان کا پتا دو‘ میں اس سے ملنا چاہتا ہوں‘‘۔ مولانا نے اپنی نوجوانی کی لاابالی کیفیت میں جواب دیا کہ ’’تم کو اس بھرے بازار میں انسان نظر نہیں آتے؟ کندھے سے کندھا چھل رہا ہے‘ کھوے سے کھوا ٹکرا رہا ہے اور تم انسان تلاش کر رہے ہو؟‘‘ اس درویش نے کہا: ’’کہاں ہیں انسان؟ مجھے تو کہیں انسان نظر نہیں آرہے!‘‘ مولانا احمد

علیؒ فرماتے ہیں کہ مجھ پر بھی اس وقت یہ کیفیت طاری ہوئی کہ مجھے یہ مشاہدہ ہوا کہ کسی دوکان پر خنزیر بیٹھا ہوا ہے‘ کہیں کوئی بھیڑیا ہے اور کہیں کوئی ریچھ ہے‘ سب کے سب درندے تھے‘ جو درحقیقت انسان کے لبادے میں براجمان تھے۔ یہی بات ہے جو علامہ اپنے اس شعر میں کہہ رہے ہیں: ’’آدمی درّندہ بے دندان و چنگ!‘‘ — آگے علامہ کہتے ہیں:

رزقِ خود را از زمیں بردن رواست
ایں متاعِ بندہ و ملک خداست
بندۂ مومن امیں‘ حق مالک است
غیر حق ہر شے کہ بینی‘ ہالک است
رأیتِ حق از ملوک آمد نگوں
قریہ ہا از دخلِ شاں خوار و زبوں
آب و نانِ ماست از یک مائدہ
دودۂ آدم کَنَفْسٍ وَّاحِدہ(۶)

میں ان اشعار کے ترجمے اور تشریح کے بجائے یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ معاش کا مسئلہ یقیناً بہت اہم ہے اور اگر کسی معاشرے اور نظام میں معاشی عدل قائم نہ ہو تو انسان سب سے زیادہ اس ناانصافی سے متاثر ہوتا ہے۔ اسی لیے علامہ اقبال نے یہاں تک کہہ دیا ہے: ؎

کس نباشد در جہاں محتاجِ کس
نکتہ شرعِ مبیں این است و بس(۷)

اگر کسی کی شخصی آزادی اور حریت کچلی جا رہی ہو تو وہ بھی بڑی ناانصافی ہے۔ چنانچہ دورِ

(۶) زمین سے اپنے لیے رزق کا حصول جائز ہے‘ لیکن یہ انسان کے لیے صرف استعمال کی چیز ہے۔ ملکیت صرف خدا کی ہے۔ بندۂ مؤمن (اپنے مال و متاع کا صرف) امین ہے‘ مالک خدا ہے۔ خدا کے سوا جو کچھ دیکھتے ہو‘ سب فانی اور ہلاک ہو جانے والا ہے۔ حق کا پرچم بادشاہوں کے باعث نیچا ہو جاتا ہے اور ان کی وجہ سے بستیوں کی بستیاں خوار و بدحال ہو جاتی ہیں۔ ہمارا آب و دانہ ایک ہی دسترخوان سے ہے‘ اس لیے کہ آدم کا پورا خاندان ایک جان کی مانند ہے۔

(۷) شریعت حقہ اور نظامِ اسلامی کا اصل مقصود یہی ہے کہ دنیا میں کوئی کسی کا محتاج نہ رہے۔



فاروقی میں ایک گورنر — گورنر بھی کون! فاتح ایران‘ یکے از عشرہ مبشّرہ‘ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ — نے اپنے مکان کے باہر ایک ڈیوڑھی بنا لی تھی اور ایک پہریدار بٹھا دیا تھا۔ اس پر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے مدینہ منورہ سے اپنے قاصد کو یہ ہدایت دے کر بھیجا تھا کہ جا کر اس دیوڑھی کو آگ لگا دے اور پھر ایران کے گورنر کو امیر المؤمنین کی طرف سے یہ ڈانٹ سنائے کہ ’’اے سعد! لوگوں کو ان کی ماؤں نے آزاد پیدا کیا تھا‘ تم نے ان کو اپنا غلام کیسے سمجھ لیا؟‘‘ پس حریت کی راہ میں کوئی رکاوٹ بھی کسی درجہ میں پسندیدہ نہیں‘ لیکن یہ غیر منصفانہ معاشی تقسیم اور اس ضمن میں یہ ظالمانہ اور استحصالی نظام اور پھر اس کے نتیجے میں haves اور have nots کی طبقاتی تقسیم‘ مستکبرین اور مستضعفین کے طبقات کا عملی ظہور انسان کا شعور اور احساس اس کو بمشکل برداشت کرتا ہے۔ اسی لیے قرآن مجید میں مالِ فے کی تقسیم کا حکم دے کر واضح فرما دیا گیا: ﴿كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةً بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ﴾ (الحشر:۷) ’’تاکہ دولت تم میں سے مال داروں ہی کے درمیان گردش میں نہ رہے۔‘‘

یہ قرآن حکیم کی اہم اصولی ہدایات میں سے ایک ہے جس میں اسلامی معاشی نظام کی معاشی پالیسی کا بنیادی ضابطہ اور قاعدہ بیان کیا گیا ہے کہ دولت معاشرے کے صرف مالداروں میں ہی نہ گھومتی رہے بلکہ ایسا معاشی نظام رائج و نافذ ہو کہ جس کے نتیجے میں دولت کی گردش پورے معاشرے میں عام ہو۔ اب خود فیصلہ کیجیے کہ قرآن کی اس ہدایت اور مقصد کے بالکل خلاف ایک معاشی نظام چل رہا ہو اور haves یعنی اغنیاء اور have nots یعنی فقراء کی خلیج وسیع سے وسیع تر ہوتی چلی جا رہی ہو‘ فرق و تفاوت اتنا بڑھ رہا ہو کہ تناسب ایک جگہ قائم رہنے کے بجائے روز تبدیل ہو رہا ہو تو اس معاشرے میں آخر وہ جذبات و خیالات اور احساسات کیسے پنپ سکیں گے جو خیر پر مبنی ہوں؟ ماحول اس کو غذا دینے کے لیے تیار نہ ہو‘ بلکہ وہ ہر اس جذبے کو کچلنے کے درپے ہو جس میں خیر کی کوئی رمق موجود ہو تو وہاں اصلاح کی کوئی کوشش کیسے کامیاب ہو سکے گی؟

## اصلاحِ معاشرہ کے لیے انقلاب ناگزیر ہے!

اب سوال یہ ہے کہ ان حالات میں کیا کریں‘ ان کے بدلنے کی کوئی سبیل ہے بھی یا نہیں؟ یہ ہے میری آج کی گفتگو کا دوسرا حصہ۔ میں کئی بار یہ بات عرض کر چکا ہوں کہ اس کے

لیے محض دعوت وتبلیغ اور وعظ وتلقین کی ضرورت نہیں ہے' بلکہ انقلاب کی ضرورت ہے۔اس انقلاب سے مراد بھی اسلامی انقلاب ہے' محض ہاتھوں کو بدل دینے والا انقلاب نہیں' محض کسی شخص کو نفرت کا نشانہ بنا کر اس کی ٹانگیں کھینچنے والا انقلاب نہیں' محض ایک معاشی نعرے کی بنیاد پر برپا ہونے والا انقلاب نہیں۔ بلکہ اسلامی انقلاب مراد ہے جو اپنی بنیادوں پر استوار ہوگا' جو اپنی جڑ سے غذا حاصل کرے گا اور وہ بنیاد و اساس اور جڑ ایمان ہے۔ وہ ایمان و ایقان سے اصل قوت حاصل کرے گا اور پھر اس میں وہ سارے مراحل آئیں گے جو مراحل انقلابِ محمدی ﷺ میں تھے۔

اس ضمن میں یاد رکھیے کہ دو انتہاؤں سے بڑی احتیاط کے ساتھ بچنے کی ضرورت ہے۔ (۱) دین کا وہ تصورِ نیکی جس میں انقلاب کا تصور ہی شامل نہ ہو۔ وہ بھی شیطان کا ایک بہت بڑا پھندا ہے۔ (۲) انقلاب کا ایسا شیدائی ہو جانا کہ جیسا بھی انقلاب آئے' آئے ضرور۔ یہ بھی دراصل شیطان کا دوسرا اُتنا ہی بڑا پھندا ہے۔ انقلاب کا تصور ہو لیکن وہ سرتاسر انقلابِ محمدیؐ کا تصور ہو۔ وہ انقلاب کامل اسلامی انقلاب ہو۔ اس کے اپنے مقدمات پر اس کا آغاز ہو۔ اُسے اپنی جڑوں سے قوت حاصل ہو رہی ہو۔

## انقلابی عمل کے لوازم و مراحل

وہ انقلاب کیا ہے اور خاص طور پر اس کا قرآن حکیم سے کیا تعلق ہے' آج کے موضوع کی مناسبت سے میں اب اس کو واضح کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے یہ باتیں کئی بار عرض کی ہیں اور آپ میں سے اکثر کے علم میں ہوں گی' لیکن جن کے علم میں نہ ہوں اُن کے لیے اختصار سے عرض کیے دیتا ہوں۔

میرے نزدیک کسی بھی انقلاب کے چھ مراحل ہیں' تین ابتدائی ہیں اور تین تکمیلی۔ ابتدائی تین مراحل یہ ہیں:

۱) **انقلابی نظریہ**: انقلابی عمل کا پہلا مرحلہ یہ ہے کہ کوئی ''انقلابی نظریہ'' موجود ہو اور اس کی نشر و اشاعت کا اہتمام ہو۔ محض وعظ کے ذریعے انقلاب نہیں آئے گا۔ نیکی کے اُن تصورات کے ذریعے جو عام طور پر دینی حلقوں میں رائج ہیں' انقلاب نہیں آئے گا۔ انقلاب تو وہیں آئے گا جہاں ایک انقلابی نظریہ رائج الوقت نظام کی جڑوں پر تیشہ چلا رہا ہو۔ اگر ایسا ہے تو انقلاب کا عمل ابتدائی طور پر جاری اور روشناس (initiate) ہوگا۔ اگر ایسا کوئی انقلابی نظریہ نہیں ہے



تو پھر وہ انقلابی عمل نہیں ہوگا' بس ایک اصلاحی (reformatory) عمل ہوگا جس سے سماجی برائیوں کی اصلاح کا کام ہو جائے گا' کوئی علمی تحقیق کا کام ہو جائے گا' کچھ ذہنوں کی جلا کا کام ہو جائے گا۔ لیکن یہ سب کام ہرگز انقلابی کام شمار نہیں ہوں گے۔ انقلاب کے لیے تو ایک انقلابی نظریہ لازم و ناگزیر ہے۔ یہ ہے کسی بھی انقلاب کا پہلا اور بنیادی مرحلہ۔

۲) **تنظیم**: انقلابی عمل کا دوسرا مرحلہ یہ ہوگا کہ جو لوگ اس انقلابی نظریے کو قبول کر لیں انہیں ایک ہیئت اجتماعی کے تحت منظّم کیا جائے۔ اس طرح ایک انقلابی جماعت وجود میں آئے۔ اس جماعت کے لیے دو چیزیں لازمی ہوں گی۔ اولاً یہ بڑی مضبوط ڈسپلن والی جماعت ہونی چاہیے' تاکہ معلوم ہو کہ یہ محض ہجوم (mob) نہیں ہے' بلکہ ایک مجتمع قوت ہے جس کو شکست دینا آسان نہیں ہے۔ ثانیاً یہ کہ اس تنظیم میں کارکنوں کی حیثیت اور مرتبے کا تعین تحریک کے ساتھ وفاداری اور قربانی کی بنیاد پر ہونا چاہیے۔

۳) **تربیت**: انقلابی عمل کا تیسرا مرحلہ یہ ہوگا کہ جو لوگ اس انقلابی نظریے کو قبول کریں ان کی تربیت کا انتظام ہو۔ ظاہر بات ہے کہ یہ تربیت نظریے کے ساتھ ہم آہنگ ہونی ضروری ہے۔ نظریہ اگر کسی خالص مادی انقلاب کو جنم دینے والا ہے تو اس کے لیے تربیت بھی صرف مادّی درکار ہوگی۔ اس کے لیے کسی رُوحانی اور اخلاقی تربیت کی کوئی ضرورت نہیں۔ ایسی کوئی قدغن مادّی انقلاب قبول کر ہی نہیں سکتا' بلکہ اسے احمقانہ قرار دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بالشوئزم کے حقیقی انقلابی نظریے میں جنسی پابندیوں (sex discipline) کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ جس طرح ایک پیاسا انسان آزاد ہے کہ وہ اس جذبے کی جس طرح چاہے تسکین کر لے' اسی طرح کامریڈ مرد اور عورتیں آزاد ہیں کہ باہمی رضامندی سے جب چاہیں' جیسے چاہیں اپنے جنسی جذبے کی تسکین کا سامان کر لیں۔ اس طور پر جو اولاد ہوگی وہ ریاست کی ملکیت ہوگی اور ان کی پرورش ریاست کے ذمہ ہوگی۔ لیکن اسلامی نظام لانا ہے تو اس کی مناسبت سے اگر تربیت کا نظام نہیں ہے تو یہ بیل منڈھے نہیں چڑھے گی' قدم آگے نہیں بڑھیں گے۔ ہوسکتا ہے کہ آپ کسی اور کا کام انجام دے دیں۔ حالانکہ ہونا تو یہ چاہیے کہ ؎

کارِ خود کن کارِ بیگانہ مکن　　بر زمینِ دیگرے خانہ مکن!

کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم انقلاب کے شوق میں کسی اور کا کام کر رہے ہوں۔ اس لیے کہ اگر تربیت

کے اس دوسرے مرحلے میں کتاب وسنت کا عطا کردہ تربیتی نصاب پیش نظر نہیں ہے تو پھر سارا انقلابی کام اسلامی انقلاب کا نہیں‘ کسی اور انقلاب کا کام ہے۔ ذرا نگاہِ بازگشت ڈالئے تو نظر آئے گا کہ ماضی میں یہی کچھ ہوتا رہا ہے۔ متحدہ محاذ بنے‘ بڑی قربانیاں دی گئیں‘ لیکن کام کن کا ہوا‘ نتائج کیا نکلے‘ تحریک کے ثمرات کس کی جھولی میں آئے؟ چنانچہ انقلاب کا دوسرا مرحلہ یہ ہے کہ اس نظریے کو ماننے اور قبول کرنے والوں کا نظریے کے مطابق تربیت کا خاص انتظام واہتمام ہو۔

## تصادم اور کشمکش کے تین مرحلے

یہ تین ابتدائی مراحل ہیں۔ ان کے بعد تین تکمیلی مراحل آتے ہیں‘ جن کے لیے ایک جامع عنوان ہے: ’’تصادم اور کشمکش‘‘۔ اس کے بھی آگے تین مرحلے ہیں:

۱) **صبر محض**: دراصل یہ مرحلہ انقلابی نظریے کی دعوت کے بعد خود بخود شروع ہو جائے گا۔ یہ کشمکش اور تصادم کا وہ دور ہے جس میں انقلابی کارکنوں کے لیے صبر وتحمل اور استقامت کی ضرورت ہے‘ کہ ماریں کھاؤ‘ ہاتھ نہ اُٹھاؤ! اگر اس ابتدائی دور میں کوئی انقلابی جماعت متشدّد (violent) ہو جائے‘ جلد باز اور ناعاقبت اندیش ہو جائے تو کچل دی جائے گی اور ختم کر دی جائے گی۔ لہٰذا اس دور کے لیے حکم ہوتا ہے کہ ماریں کھاؤ‘ ظلم وتعدی برداشت کرو‘ لیکن تم کو کسی بھی جوابی اقدام اور کارروائی کی اجازت نہیں ہے۔ اصل میں یہ دور تھا جس سے حضرتِ مسیح علیہ السلام کو سابقہ پیش آیا تھا۔ جو لوگ اس مرحلے کے تقاضوں کو نہیں سمجھتے وہ حضرت مسیحؑ پر زبانِ طعن دراز کر دیتے ہیں۔ آپؑ کی دعوت کا یہ دور صبر محض کا دور تھا اور پھر اس سے اگلا مرحلہ ان کی زندگی میں آیا ہی نہیں اور اللہ نے انہیں آسمان پر اُٹھا لیا۔ اس دور میں حضرت مسیح علیہ السلام کی تعلیم وتلقین یہ تھی کہ ’’اگر کوئی تمہارے دائیں گال پر تھپڑ مارے تو بایاں گال بھی سامنے کر دو۔ اگر کوئی نالش کر کے تمہارا جبہ لینا چاہے تو اپنا کرتہ بھی اس کے حوالے کر دو۔ اگر کوئی تمہیں بیگار میں ایک کوس لے جانا چاہے تو دو کوس جاؤ‘‘۔ یہ صبر ومصابرت کا دور ہے جسے میں نے تصادم وکشمکش کا پہلا مرحلہ یعنی صبرِ محض (passive resistance) قرار دیا ہے۔

۲) **راست اقدام**: دوسرا دور وہ آتا ہے جب ایک قابلِ لحاظ جمعیت اور قوت فراہم ہو جاتی ہے اور وہ ماریں کھا کھا کر اور ظلم وجور کی بھٹی سے گزر کر کندن بن جاتی ہے۔ اب اقدام (active resistance) کا مرحلہ آتا ہے۔



۳) **مسلّح تصادم**: انقلابی مراحل میں اقدام کے بعد آخری مرحلہ براہِ راست تصادم کا ہو گا۔ ظاہر ہے کہ جب اقدام ہوا اور اس نظام کو کہیں سے چھیڑا جائے‘ کہیں سے اس کی کوئی دکھتی رگ دبائی جائے تو وہ نظام جوابی کارروائی (retaliate) ضرور کرے گا۔ ترکی بہ ترکی جواب دے گا اور اس اُبھرتی ہوئی انقلابی دعوت کو کچلنے کے درپے ہو جائے گا۔ یہیں سے تصادم وکشمکش کے تیسرے مرحلے ’’مسلح تصادم‘‘ (armed conflict) کا آغاز ہو جائے گا۔ میں عرض کر چکا ہوں کہ اس کے بغیر کوئی انقلاب کبھی نہیں آیا۔ اگر آ سکتا ہوتا تو وہ انقلابِ محمدی ﷺ ہوتا۔

## اسلامی انقلاب کے مراحل

ان چھ انقلابی مراحل کو سامنے رکھیے اور دیکھئے کہ ان مراحل کا اسلامی انقلاب کے مراحل پر انطباق (application) کس طور پر ہوتا ہے۔ میں اس موقع پر ابتدائی تین مراحل پر تو قدرے تفصیل سے کچھ عرض کروں گا‘ لیکن تکمیلی تین مراحل کا اجمالی ذکر کروں گا‘ اس لیے کہ ایک تو وقت محدود ہے اور دوسرے انقلاب کا تکمیلی اور آخری مرحلہ یعنی مسلح تصادم کافی وضاحت کا متقاضی ہے‘ جسے اتنے کم وقت میں بیان کرنا مشکل ہے۔ دراصل یہ معاملہ ہمارے اکثر جدید تعلیم یافتہ حضرات کے لیے بڑا بھیانک اور ڈراؤنا ہے۔ پھر دو سو سال کی غلامی اور مغربی مستشرقین کے اس پروپیگنڈے سے متاثر ہو کر کہ ’’اسلام تلوار سے پھیلا ہے‘‘ اور یہ کہ ع ’’بوئے خوں آتی ہے اس قوم کے افسانوں سے!‘‘ ہم نے معذرت خواہانہ (apologetic) رویہ اختیار کر لیا ہے اور مسلح تصادم کے نام سے ہمارے اعصاب پر رعشہ طاری ہو جاتا ہے۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ کوئی بھی انقلاب تلوار اٹھائے بغیر نہیں آ سکتا اور انقلابِ محمدی ﷺ بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ پھر قرآن حکیم میں قتال فی سبیل اللہ کی اہمیت سورۃ الصّف کی اس آیت میں واضح ہو جاتی ہے:

﴿اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ ۝﴾۔

## اسلام کا نظریۂ انقلاب: ’’قرآن مجید‘‘

بہرحال ذکر انقلاب کے ابتدائی مراحل کا تھا تو جان لیجیے کہ اسلام کا نظریہ انقلاب ہے: ’’قرآن حکیم‘‘۔ اب آگے اصطلاحات بدل جائیں گی اور مروّجہ اصطلاحات کی جگہ اسلامی اصطلاحات آئیں گی‘ مثلاً نشر واشاعت کی جگہ دعوت وتبلیغ۔ مفہوم وہی رہے گا‘ بس اصطلاح کا نام بدل جائے گا — یہاں نظریۂ انقلاب کے لفظ سے مجھے علامہ اقبال کے چند اشعار بے ساختہ یاد آ گئے:

کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک صاف
منعموں کو مال و دولت کا بناتا ہے امیں!
اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب
پادشاہوں کی نہیں، اللہ کی ہے یہ زمیں!

علامہ نے یہ تمام نظریات قرآن مجید سے اخذ کیے ہیں۔ درحقیقت روئے زمین پر قرآن حکیم سے بڑھ کر تو کجا اس سے کمتر بھی، ایک صالح انقلاب کے نظریے کی حامل کوئی دوسری کتاب موجود ہی نہیں ہے۔ یہ کتابِ مبین اعتقادات سے لے کر زندگی کے ہر معاملے، ہر پہلو اور ہر گوشے میں انقلاب کی داعی کتاب ہے۔ یہ کتاب ہر باطل نظریے اور ہر باطل فکر و عمل کے لیے تیغ عریاں ہے۔

قرآن حکیم کے یہ حقائق اس کے معروضی (objectively) مطالعہ سے منکشف ہوتے ہیں۔ محض پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کرنے کے لیے یا محض کوئی تحقیقی مقالہ لکھنے کی غرض سے اس کا جزوی مطالعہ یا صرف وعظ کہنے کے لیے اس کی چند آیات کو یاد کر لینے سے قرآن حکیم کے انقلابی نظریے، اس کے انقلابی پیغام، اس کی انقلابی دعوت اور اس کے انقلابی لائحہ عمل تک رسائی ہونا دشوار ہے۔ جب قرآن کی حقیقی تعلیمات کو سمجھنے کے لیے کوئی ارادہ ساتھ ہوگا—— وہی ارادہ جہاں سے میں نے گفتگو شروع کی تھی، جہاں سے تعمیر سیرت و کردار کا پروگرام شروع ہوتا ہے —— اگر وہ ارادہ فی الواقع ہو اور کہیں ''مرید'' وجود میں آ جائے جو چاہتا ہو کہ ہم قرآن مجید کو سمجھیں بھی اور اس پر عمل بھی کریں تو وہ جان لے کہ قرآن حکیم سے بڑھ کر دنیا میں اور کوئی انقلابی کتاب نہیں۔ یہ بات وہ ہے جو غیروں نے کہی ہے، دشمنوں نے کہی ہے۔ ہم نے تو اس کے پَر ہر طرف سے کاٹ دیے ہیں۔ اس کے ساتھ جو تصورات وابستہ کیے ہیں وہ بس ایک مقدس کتاب کے ہیں۔ اس کا نظریہ اور اس کی انقلابیت ہماری نگاہوں سے اوجھل ہے، لیکن دوسروں نے اس کو پا لیا ہے۔ اسی شہر لاہور میں مشہور سوشلسٹ لیڈر ایم این رائے نے کہا تھا کہ ''قرآن سے بڑھ کر کوئی انقلابی کتاب نہیں اور محمد (ﷺ) سے بڑا تاریخِ انسانی میں کوئی انقلابی لیڈر نہیں''۔ اور شاید گلیڈسن یا لائیڈ جارج نے کہا تھا کہ ''جب تک دنیا میں قرآن موجود رہے گا دُنیا میں امن قائم نہیں ہوسکتا''۔ آریہ سماجی مشہور لیڈر سوامی شردھانند نے بھی قرآن کے بارے میں اسی نوع کا اظہارِ خیال کیا تھا۔ یہ اس لیے کہ انہوں نے خوب اچھی



طرح جان لیا تھا کہ قرآن محض ایک کتابِ مقدس ہی نہیں ہے، بلکہ سراسر ایک انقلابی نظریے کی حامل کتاب ہے اور انقلاب کے مراحل میں مسلح تصادم ایک مسلم حقیقت (established fact) کی حیثیت سے دنیا میں تسلیم کیا جاتا ہے۔

انہوں نے تو یہ بات تعصب اور مخالفت کے جذبے سے کہی تھی اور ان کا انداز بھی منفی (negative) ہے، لیکن یہ قرآن کو بہت بڑا خراجِ تحسین (tribute) ہے کہ یہ قرآن تو انسان کے اندر آگ بھر دیتا ہے، بشرطیکہ قرآن مجید کا راہنمائی حاصل کرنے کے لیے معروضی مطالعہ کیا جائے۔ کتنی پیاری بات کہی ہے علامہ اقبال نے:

پیشِ ما یک عالمِ فرسودہ است
ملت اندر خوابِ اُو آسودہ است
رفت سوزِ سینہ تاتار و کُرو
یا مسلماں مُرد یا قرآں بمُرد![8]

یہ ہوا کیا ہے؟ مسلمان مر گیا ہے یا قرآن میں تاثیر باقی نہیں رہی؟ قرآن نے تو اس سینہ گیتی پر تاریخ انسانی کا عظیم ترین انقلاب برپا کیا تھا۔ قرآن نے تو نوعِ انسانی کو وہ صالح نظام دیا تھا جس کی یاد انسان کے حافظے میں ایک سہانے خواب کے مانند ابھی تک موجود ہے۔

ہر کُجا بینی جہانِ رنگ و بو
زانکہ از خاکش بروید آرزو
یا ز نورِ مصطفیٰ او را بہاست
یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفیٰ است[9]

انسان کا ذہن شعوری و غیر شعوری طور پر اس صالح نظام کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ اس کی

(۸) ہمارے سامنے ایک پرانا اور گھسا پٹا عالَم ہے اور ملتِ اسلامی اس کی خاک نشینی ہی میں آسودگی محسوس کر رہی ہے۔ مسلمان اقوام مثلاً مغلوں اور کُردوں کے سینے حرارت سے کیوں خالی ہو گئے؟ آیا مسلمان پر موت طاری ہوگئی ہے یا خود قرآن ہی کے حیات بخش سوتے خشک ہو گئے ہیں!

(۹) تم (آج) جہاں کہیں رنگ و بو کی وہ دنیا دیکھتے ہو جس کی خاک سے ''آرزو'' نشو و نما پاتی ہے، وہ یا تو نورِ مصطفیٰ سے روشن ہے یا اب تک تلاشِ مصطفیٰ ﷺ میں سرگرداں ہے۔

روح اس صالح نظام کی برکات سے اپنی تشنگی کو آسودگی سے بدلنے کے لیے بھٹک رہی ہے۔ انسانیت کے اجتماعی تحت الشعور میں یہ بات موجود ہے کہ ایک صالح نظام اس دنیا میں فی الواقع قائم ہو چکا ہے۔ یہ کوئی پریوں کی کہانی (fairy tale) نہیں ہے‘ بلکہ یہ ایک حقیقت ہے۔ یہ کوئی ماقبل تاریخی دور (pre historicera) کی بات نہیں ہے۔ یہ واقعہ تو تاریخ کے نصف النہار میں ظہور پذیر ہوا ہے۔ پس قرآن حکیم کا انقلابی نظریہ ہمارے پاس موجود ہے۔ اس ضمن میں علامہ کے یہ اشعار مجھے بلاارادہ فی البدیہہ طور پر یاد آ رہے ہیں: ؎

اے کہ می نازی بہ قرآنِ عظیم　　تا کجا در حجرہ ہا باشی مقیم
در جہاں اَسرارِ دیں را فاش کن　　نکتہ ٔ شرعِ مبیں را فاش کن!

اے وہ شخص یا قوم جسے حاملِ قرآن عظیم ہونے پر فخر ہے! کب تک حجروں میں مقیم رہو گے اور قرآن پر ناز کرتے رہو گے؟ اٹھو اور دنیا میں دین حق کے اسرار و رموز کو عام کرو اور شریعت اسلامی کے رموز و حکم کی تشہیر و اشاعت کے لیے سرگرم ہو جاؤ! اس قرآن کے اسرار و رموز‘ اس کے عبر و حکم‘ اس کی رہنمائی و ہدایت‘ اس کے انقلابی تصورات و انقلابی دعوت اور اس کا پیغام آخر کب تک چھپے رہیں گے؟ انہیں منصۂ شہود پر آنا چاہیے۔

## اسلامی انقلاب کے لیے قرآن حکیم کی اصطلاحات

**دعوت و تبلیغ:** اسلام کا نظریۂ انقلاب قرآن ہے اور اس کی نشر و اشاعت کے لیے قرآن حکیم کی بہت سی اصطلاحات ہیں۔ اس بارے میں یہ نوٹ کر لیجیے کہ اسلام کی جتنی بھی اصطلاحات ہیں‘ ان سب کا مرکز و محور‘ مبنیٰ و مدار قرآن اور صرف قرآن ہے۔ ان اصطلاحات میں سب سے زیادہ کثیر الاستعمال اور عام فہم اصطلاح دعوت و تبلیغ ہے۔ تبلیغ سے مراد یہ نہیں ہے کہ اختلافی مسائل کی تبلیغ کی جائے۔ جیسے آج کل ’’عظیم الشان تبلیغی کانفرنسیں‘‘ منعقد ہو رہی ہیں‘ لیکن ان کا موضوع تبلیغ اسلام اور قرآن نہیں‘ بلکہ رفع یدین اور آمین بالجہر جیسے اختلافی مسائل ہوتے ہیں یا نور و بشر جیسے موضوعات ہوتے ہیں۔

اس حوالے سے یاد رکھیے کہ تبلیغ سے مراد ہے قرآن مجید کی تبلیغ اور اسی کا حکم دیا گیا تھا رسول اللہ ﷺ کو: ﴿یٰٓاَیُّهَا الرَّسُوۡلُ بَلِّغۡ مَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡكَ مِنۡ رَّبِّكَ ؕ وَاِنۡ لَّمۡ تَفۡعَلۡ فَمَا بَلَّغۡتَ رِسَالَتَهٗ ؕ﴾ (المائدۃ:٦٧) ’’اے رسول (ﷺ) پہنچا دیجیے جو کچھ نازل کیا گیا ہے آپؐ



کی طرف آپؐ کے رب کی جانب سے۔ اور اگر (بالفرض) آپؐ نے ایسا نہ کیا تو گویا آپؐ نے اُس کی رسالت کا حق ادا نہیں کیا‘‘۔ یہی وہ بات تھی جس پر گواہی لی تھی حجۃ الوداع کے موقع پر نبی اکرم ﷺ نے —— اس لیے کہ اللہ کے ہاں جا کر انہیں بھی جواب دینا تھا‘ وہ بھی مسئول تھے۔ اس ضمن میں سورۃ الاعراف کی آیت ٦ ذہن میں لایئے: ﴿فَلَنَسۡـَٔلَنَّ الَّذِیۡنَ اُرۡسِلَ اِلَیۡهِمۡ وَلَنَسۡـَٔلَنَّ الۡمُرۡسَلِیۡنَ ۙ۝۶﴾ ’’ہم تو پوچھیں گے ان سے بھی جن کی طرف رسولوں کو بھیجا گیا اور ان سے بھی جن کو رسول بنا کر بھیجا گیا‘‘۔ یہ ہے وہ احساس جس کے لیے میدانِ عرفات میں نبی اکرم ﷺ نے تقریباً سوا لاکھ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے مجمع سے گواہی لی ہے: ((اَلَا هَلۡ بَلَّغۡتُ؟)) لوگو سنو! کیا میں نے پہنچا دیا؟ اس پر پورے مجمع نے یک زبان ہو کر جواب دیا: نَشۡهَدُ اَنَّكَ قَدۡ بَلَّغۡتَ وَاَدَّیۡتَ وَنَصَحۡتَ[۱۰]۔ ایک روایت میں الفاظ آتے ہیں: اِنَّا نَشۡهَدُ اَنَّكَ قَدۡ بَلَّغۡتَ الرِّسَالَةَ وَاَدَّیۡتَ الۡاَمَانَةَ وَنَصَحۡتَ الۡاُمَّةَ وَكَشَفۡتَ الۡغُمَّةَ کہ ہاں ہم گواہ ہیں آپ ﷺ نے رسالت کا حق ادا کر دیا‘ آپؐ نے امانت کا حق ادا کر دیا (یہ قرآن آپؐ کے پاس اللہ کی امانت تھی جو آپؐ نے ہم تک پہنچا دی)‘ آپؐ نے اُمت کی خیر خواہی کا حق ادا کر دیا اور آپؐ نے گمراہی اور ضلالت کے اندھیروں کا پردہ چاک کر دیا —— غور کیجیے کہ اس موقع پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی طرف سے تین چار الفاظ میں جواب دیا گیا‘ حالانکہ صحابہ کرامؓ کا یہ معمول نہیں تھا‘ بلکہ حضور ﷺ کے سوال کے جواب میں صحابہؓ عموماً عرض کیا کرتے تھے: اَللّٰهُ وَرَسُوۡلُهٗ اَعۡلَمُ اور اگر کہیں دوبارہ پوچھا جاتا تو بہت مختصر سا جواب دیتے۔ لیکن یہاں صحابہ کرامؓ نے معمول سے ہٹ کر تین چار الفاظ میں جواب دیا۔ یہ سوال و جواب اس لیے کہ آخرت میں جواب دہی ہوگی۔

پھر یہ فریضۂ تبلیغ جناب محمدٌ رسول اللہ ﷺ اپنی اُمت کے حوالے کر گئے اور فرمایا: ((فَلۡیُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الۡغَائِبَ))[۱۱] ’’پس اب پہنچائیں وہ جو یہاں موجود ہیں ان تک جو موجود

---

(۱۰) صحیح مسلم‘ کتاب الحج‘ باب حجۃ النبی ﷺ۔ وسنن ابی داؤد‘ کتاب المناسک‘ باب صفۃ حجۃ النبی ﷺ۔

(۱۱) صحیح البخاری‘ کتاب الحج‘ باب الخطبۃ ایام منٰی۔ وصحیح مسلم‘ کتاب القسامۃ والمحاربین والقصاص والدیات‘ باب تغلیظ تحریم الدماء والاعراض والاموال۔

نہیں ہیں۔'' میں سبکدوش ہوا' میری ذمہ داری ختم ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے ﴿اِنَّا سَنُلْقِیْ عَلَیْكَ قَوْلًا ثَقِیْلًا ۝۵﴾ (المزمل) ''ہم عنقریب آپؐ پر ایک بھاری بات ڈالنے والے ہیں'' فرما کر جو بھاری ذمہ داری میرے کاندھے پر ڈالی تھی آج وہ قولِ ثقیل میرے کاندھے سے تمہارے کاندھوں پر منتقل ہوگیا ہے۔ اب پہنچائیں وہ جو یہاں ہیں' اُن کو جو یہاں نہیں ہیں۔ اس سے زیادہ بلیغ الفاظ ممکن نہیں ہیں' اس لیے کہ یہ الفاظ زمان و مکان دونوں کا احاطہ کر رہے ہیں۔ اُس وقت روئے زمین میں موجود ایک ایک انسان اس میں شامل ہے اور تا قیامِ قیامت آنے والی نسلیں بھی اس میں شامل ہیں۔

**تذکیر**: دوسری اہم اصطلاح ''تذکیر'' ہے ــــ قرآن مجید اپنے آپ کو ''ذکریٰ'' بھی کہتا ہے اور ''تذکیر'' بھی (۱۲) ــــ اس تذکیر کے لیے آلۂ تذکیر قرآن ہے۔ فرمایا: ﴿فَذَكِّرْ بِالْقُرْاٰنِ مَنْ یَّخَافُ وَعِیْدِ ۝۴۵﴾ (قٓ) ''(اے نبی ﷺ!) آپ تذکیر کیجیے قرآن کے ذریعے سے اس کو جو میری پکڑ سے ڈرتا ہو۔''

**تبشیر**: اسی طرح ایک اصطلاح ''تبشیر'' ہے۔ بشریٰ بھی قرآن مجید کی اہم اصطلاحات میں سے ہے اور سورہ البقرۃ اور سورۃ النحل میں قرآن مجید کے لیے بشریٰ کا لفظ آیا ہے۔ سورۃ البقرۃ میں فرمایا: ﴿بُشْرٰی لِلْمُؤْمِنِیْنَ ۝۹۷﴾ اور سورۃ النحل میں دو مرتبہ فرمایا: ﴿بُشْرٰی لِلْمُسْلِمِیْنَ ۝﴾ (آیت ۸۹ اور ۱۰۲) کہ قرآن مسلمانوں اور مؤمنین کے لیے بشارت ہے۔

**انذار**: تبشیر کے مقابلے میں ایک اور اہم اصطلاح ''انذار'' ہے' اور یہ انذار بھی قرآن کے ذریعے سے ہوگا: ﴿وَاُوْحِیَ اِلَیَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ ؕ﴾ (الانعام:۱۹) ''اور میری طرف یہ قرآن وحی کیا گیا ہے تاکہ میں تمہیں بھی اس کے ذریعے خبردار کردوں اور ان کو بھی جن تک یہ قرآن پہنچے''۔ اس حوالے سے سورۃ الشوریٰ کی وہ آیت ذہن میں لائیے: ﴿وَكَذٰلِكَ اَوْحَیْنَاۤ اِلَیْكَ قُرْاٰنًا عَرَبِیًّا لِّتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰی وَمَنْ حَوْلَهَا وَتُنْذِرَ یَوْمَ الْجَمْعِ لَا رَیْبَ فِیْهِ ؕ﴾ (آیت ۷) ''اور اسی طرح ہم نے وحی کیا ہے آپ کی طرف یہ قرآنِ عربی تاکہ

(۱۲) ﴿وَلٰكِنْ ذِكْرٰی لَعَلَّهُمْ یَتَّقُوْنَ ۝۶۹﴾ (الانعام) ﴿فَلَا یَكُنْ فِیْ صَدْرِكَ حَرَجٌ مِّنْهُ لِتُنْذِرَ بِهٖ وَذِكْرٰی لِلْمُؤْمِنِیْنَ ۝۲﴾ (الاعراف) ﴿وَجَآءَكَ فِیْ هٰذِهِ الْحَقُّ وَمَوْعِظَةٌ وَّذِكْرٰی لِلْمُؤْمِنِیْنَ ۝۱۲۰﴾ (هود)



آپ خبردار کر دیں بستیوں کے مرکز اور اس کے اردگرد رہنے والوں کو اور آپ خبردار کر دیں اُس جمع ہونے والے دن سے جس میں کوئی شک نہیں۔''

تبشیر اور انذار کا ذریعہ بھی قرآن ہے اور یہ دونوں چیزیں بڑی خوبصورتی سے سورۂ مریم کے اختتام پر جمع ہوگئی ہیں: ﴿فَاِنَّمَا یَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ لِتُبَشِّرَ بِهِ الْمُتَّقِیْنَ وَتُنْذِرَ بِهٖ قَوْمًا لُّدًّا ۝۹۷﴾ ''تو ہم نے آسان کر دیا ہے اس (قرآن) کو آپؐ کی زبان میں تاکہ آپؐ بشارت دیں اس کے ساتھ متقین کو اور خبردار کریں اس کے ساتھ جھگڑالو قوم کو''۔ آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ اس آیت کی تلاوت کرتے ہوئے میں ''بِهٖ'' پر زور دیا کرتا ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں بِهٖ فرما کر اس بات کو نمایاں کیا گیا ہے کہ تبشیر و انذار کا حقیقی اور اصل ذریعہ قرآن مجید ہی ہے۔ اسی طرح سورۃ الکہف کے آغاز میں بھی بڑے مہتم بالشان اسلوب سے اس کا ذکر فرمایا گیا:

﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْۤ اَنْزَلَ عَلٰی عَبْدِهِ الْكِتٰبَ وَلَمْ یَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا ۝۱ قَیِّمًا لِّیُنْذِرَ بَاْسًا شَدِیْدًا مِّنْ لَّدُنْهُ وَیُبَشِّرَ الْمُؤْمِنِیْنَ الَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا حَسَنًا ۝۲﴾

''کُل حمد و ثنا اور کُل شکر اللہ ہی کے لیے ہے جس نے نازل کی اپنے بندے پر کتاب اور اس میں اُس نے کوئی کجی نہیں رکھی۔ (یہ کتاب) بالکل سیدھی ہے' تاکہ وہ خبردار کرے ایک بہت بڑی آفت سے اُس کی طرف سے اور (تاکہ) وہ بشارت دے اُن اہلِ ایمان کو جو نیک عمل کرتے ہوں کہ ان کے لیے ہوگا بہت اچھا بدلہ۔''

## قرآن کی دعوت و تبلیغ کی راہ میں رکاوٹیں

قرآن مجید کی نشر و اشاعت اور دعوت و تبلیغ کی راہ میں سب سے زیادہ رکاوٹ ڈالنے والے باطل نظریات' مشرکانہ اوہام اور مبتدعانہ افعال ہوتے ہیں۔ ہم نے قرآن کی تبلیغ کو تو پس پشت ڈال رکھا ہے اور تبلیغ کے نام سے کہیں فرقہ واریت اور فقہی مسلک پر دھواں دھار تقریریں ہیں' کہیں محض فضائل کے بیان کو تبلیغ کا نام دے دیا گیا ہے۔ مزید یہ کہ اس کے لیے بھی ذریعہ قرآن نہیں ہے' بلکہ ضعیف و شاذ اور مرسل احادیث کا سہارا ہے یا بزرگانِ دین کی کرامات کا بیان اس کی بنیاد ہے۔ اسی کا تو علامہ اقبال نے مرثیہ کہا ہے اور کیسے کیسے انداز سے کہا ہے۔ وعظ ہے تو قرآن سے نہیں' تزکیہ ہے تو قرآن سے نہیں' تذکیر ہے تو قرآن سے نہیں'

تبلیغ ہے تو قرآن کی نہیں۔ عوام ہوں کہ خواص‘ کسی کو قرآن سے نہ اعتنا ہے‘ نہ دلچسپی — اِلّا ماشاء اللہ۔ اُمتِ مسلمہ کے مختلف طبقات کا علامہ نے کس قدر صحیح نقشہ کھینچا ہے:

صوفیٔ پشمینہ پوشِ حال مست
از شرابِ نغمۂ قوال مست
آتش از شعرِ عراقی در دلش
در نمی سازد بقرآں محفلش
واعظِ دستاں زن و افسانہ بند
معنیٔ او پست و حرفِ اُو بلند
از خطیب و دیلمی گفتارِ او
با ضعیف و شاذ و مرسل کارِ اُو(۱۳)

پھر علامہ نے فقیہانِ حرم کی اکثریت کی نقشہ کشی یوں کی ہے: ؎

خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں
ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق!

لہٰذا عوام کا تو کہنا ہی کیا‘ وہ تو ہیں ہی کشتہ ملائی و سلطانی و پیری‘ ان فقیہان کی عظیم اکثریت قرآن کے معاملہ میں بے ذوق بھی ہے اور بے طلب بھی۔ بقول علامہ مرحوم ؎

صاحبِ قرآن و بے ذوقِ طلب
العجب‘ ثم العجب‘ ثم العجب!

(۱۳) اونی لباس میں ملبوس اور اپنے حال میں مست صوفی‘ قوال کے نغمے کی شراب ہی سے مدہوش ہے! اس کے دل میں عراقی کے کسی شعر سے تو آگ لگ جاتی ہے لیکن اس کی محفل میں قرآن کا کہیں گزر نہیں۔
(دوسری طرف) واعظ کا حال یہ ہے کہ ہاتھ بھی خوب چلاتا ہے اور سماں بھی خوب باندھ دیتا ہے اور اس کے الفاظ بھی پرشکوہ اور بلند و بالا ہیں لیکن معنی کے اعتبار سے نہایت پست اور ہلکے! اس کی ساری گفتگو (بجائے قرآن کے) یا تو خطیب بغدادی سے ماخوذ ہوتی ہے یا دیلمی سے‘ اور اس کا سارا سروکار بس ضعیف‘ شاذ اور مرسل حدیثوں سے رہ گیا ہے۔



## انقلابِ محمدی کی اساس و بنیاد

بہرحال میں نے اب تک جو کچھ عرض کیا ہے‘ اس سے یہ بات آپ پر واضح ہوگئی ہوگی کہ از روئے قرآن‘ تبشیر قرآن سے‘ انذار قرآن سے‘ نصیحت و موعظت قرآن سے‘ تزکیہ قرآن سے اور تبلیغ قرآن کی۔ یہ ہیں بنیادی اصطلاحات۔ قرآن مجید میں انقلابِ محمدی ﷺ کا اساسی اور بنیادی لائحہ عمل چار مرتبہ بیان کیا گیا ہے‘ اور اس کے چار عناصر ترکیبی ذکر کیے گئے ہیں‘ جن میں پہلا عنصر تلاوتِ آیات ہے۔ سورۃ البقرۃ میں حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل علیہما السلام کی دُعا میں یہ الفاظ آئے: ﴿رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلاً مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ.....﴾ (آیت ۱۲۹)۔ سورۃ البقرۃ ہی میں نبی اکرم ﷺ کی بعثت کی طرف اشارے میں بھی یہی الفاظ آئے: ﴿كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلاً مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا.....﴾ (آیت ۱۵۱)۔ اس کے بعد سورۂ آل عمران میں پھر اعادہ ہو رہا ہے: ﴿لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلاً مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ.....﴾ (آیت ۱۶۴) اور پھر آخری بار سورۃ الجمعہ میں فرمایا جا رہا ہے: ﴿هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلاً مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ.....﴾ (آیت ۲)۔ یہ تلاوتِ آیات ہے بغرضِ دعوت‘ بغرضِ تبلیغ‘ بغرضِ تبشیر‘ بغرضِ انذار اور بغرضِ تذکیر۔

یہ ہے درحقیقت انقلابِ محمدی ﷺ کا پہلا قدم۔ اگر یہ نہیں ہے‘ اور اس طور سے نہیں ہے‘ اور اس ذریعے سے نہیں ہے تو جان لیجیے کہ انقلابِ محمدیؐ یا انقلابِ اسلامی کی طرف پیش قدمی نہیں ہو رہی۔ مستعار نظریات ہوں یا انسان کے اپنے بنائے ہوئے خیالات ہوں یا کسی شخصیت کا علمی رعب اور دبدبہ لوگوں کو کھینچ کر جمع کر رہا ہو تو اسے قرآن کی انقلابی دعوت و تحریک ہرگز نہیں کہا جائے گا۔ بالفاظِ دیگر کسی تحریک اور دعوت کے عمل کا جب تک مرکز و محور اور مبنیٰ و مدار قرآن کو نہیں بنایا جائے گا‘ انقلابِ محمدی ﷺ کی طرف پیش قدمی نہیں ہوگی۔

میں چند روز قبل سورۃ الفرقان کا مطالعہ کرتے ہوئے چونک گیا۔ میں حیران ہوتا ہوں کہ قرآن حکیم کی آیات میں آنے والے لفظ ''بِہٖ'' کا ہمارے اکثر مفسرین کما حقہ حق ادا نہیں کر سکے۔ سورۃ الفرقان میں فرمایا: ﴿فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا ۝۵۲﴾ ''تو (اے نبی ﷺ!) آپ ان کفار کا کہنا نہ مانیے‘ اور آپؐ ان کے ساتھ جہاد کریں اس (قرآن) کے ذریعے سے بڑا جہاد''۔

(باقی صفحہ 66 پر)

# مسلمانوں کی اجتماعی قوت کے دو اصول

# تقویٰ اور باہمی اتفاق

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۰۲﴾ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ۠ وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖۤ اِخْوَانًا ۚ وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا ؕ كَذٰلِكَ یُبَیِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰیٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۱۰۳﴾﴾ (آل عمران)

''اے ایمان والو! ڈرتے رہو اللہ سے جیسا چاہیے اس سے ڈرنا اور نہ مریو مگر مسلمان۔ اور مضبوط پکڑو رسی اللہ کی سب مل کر اور پھوٹ نہ ڈالو اور یاد کرو احسان اللہ کا اپنے اوپر جبکہ تھے تم آپس میں دشمن پھر الفت دی تمہارے دلوں میں اب ہو گئے اس کے فضل سے بھائی' اور تم تھے کنارے پر ایک آگ کے گڑھے کے' پھر تم کو اس سے نجات دی۔ اسی طرح کھولتا ہے اللہ تم پر آیتیں تاکہ تم راہ پاؤ۔''

## ربطِ آیات

سابقہ آیات میں مسلمانوں کو اس پر تنبیہ کی گئی تھی کہ اہلِ کتاب اور دوسرے لوگ جو تمہیں گمراہی میں مبتلا کرنا چاہتے ہیں ان کی گمراہی سے باخبر رہ کر بچنے کا اہتمام کریں۔ مذکورہ دو آیتوں میں مسلمانوں کی اجتماعی قوت کو مضبوط' ناقابلِ تسخیر بنانے کے دو اہم اصول بتلائے گئے ہیں: اول تقویٰ' دوسرے باہمی اتفاق و اتحاد' اور تفرق و اختلاف سے بچنا۔



# معارف و مسائل

## مسلمانوں کی اجتماعی قوت کے دو اصول' تقویٰ اور باہمی اتفاق

مذکورہ بالا دو آیتوں میں سے پہلی آیت میں پہلا اصول اور دوسری میں دوسرا بتلایا گیا ہے' پہلا اصول جو مذکورہ آیت نے بتلایا وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے یعنی اس کی ناپسندیدہ چیزوں سے بچنے کا مکمل اہتمام جو اللہ تعالیٰ کے حق کے مطابق ہو۔

لفظ تقویٰ اصل عربی زبان میں بچنے اور اجتناب کرنے کے معنی میں آتا ہے' اس کا ترجمہ ڈرنا بھی اس مناسبت سے کیا جاتا ہے کہ جن چیزوں سے بچنے کا حکم دیا گیا ہے وہ ڈرنے ہی کی چیزیں ہوتی ہیں' یا کہ ان سے عذابِ الٰہی کا خطرہ ہے' وہ ڈرنے کی چیز۔ تقویٰ کے کئی درجات ہیں' ادنیٰ درجہ کفر و شرک سے بچنا ہے' اس معنی کے لحاظ سے ہر مسلمان متقی کہا جا سکتا ہے' اگرچہ گناہوں میں مبتلا ہو' اس معنی کے لیے بھی قرآن میں کئی جگہ لفظ متقین اور تقویٰ استعمال ہوا ہے۔ دوسرا درجہ جو اصل میں مطلوب ہے وہ ہے اس چیز سے بچنا جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے نزدیک پسندیدہ نہیں۔ تقویٰ کے فضائل و برکات جو قرآن و حدیث میں آئے ہیں وہ اسی درجہ پر موعود ہیں۔

تیسرا درجہ تقویٰ کا اعلیٰ مقام ہے جو انبیاء علیہم السلام اور ان کے خاص نائبین اولیاء اللہ کو نصیب ہوتا ہے' کہ اپنے قلب کو ہر غیر اللہ سے بچانا اور اللہ کی یاد اور اس کی رضا جوئی سے معمور رکھنا۔ مذکورہ آیت میں اتَّقُوا اللّٰهَ کے بعد حَقَّ تُقَاتِهٖ کا کلمہ بڑھایا گیا ہے کہ تقویٰ کا وہ درجہ حاصل کرو جو حق ہے تقویٰ کا۔

## حقِ تقویٰ کیا ہے؟

اس کی تفسیر حضرت عبداللہ بن مسعود اور ربیع اور قتادہ اور حسن بصری رضی اللہ عنہم نے یہ فرمائی ہے' جو مرفوعاً خود رسول اللہ ﷺ سے بھی منقول ہے:

حَقَّ تُقَاتِهٖ هُوَ اَنْ یُّطَاعَ فَلَا یُعْصٰى وَیُذْكَرُ فَلَا یُنْسٰى وَیُشْكَرُ فَلَا یُكْفَرُ (بحر محیط)

''حقِ تقویٰ یہ ہے کہ اللہ کی اطاعت ہر کام میں کی جائے' کوئی کام طاعت کے خلاف

نہ ہو اور اس کو ہمیشہ یاد رکھیں کبھی بھولیں نہیں اور اس کا شکر ہمیشہ ادا کریں کبھی ناشکری نہ کریں۔''

اسی مفہوم کو ائمہ تفسیر نے دوسرے عنوانات سے بھی ادا کیا ہے' مثلاً بعض نے فرمایا کہ حق تقویٰ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے معاملہ میں کسی کی ملامت اور برائی کی پروا نہ کرے اور ہمیشہ انصاف پر قائم رہے' اگرچہ انصاف کرنے میں خود اپنے نفس یا اپنی اولاد یا ماں باپ ہی کا نقصان ہوتا ہو' اور بعض نے فرمایا کہ کوئی آدمی اس وقت تک حق تقویٰ ادا نہیں کرسکتا جب تک کہ وہ اپنی زبان کو محفوظ نہ رکھے۔ اور قرآن کریم کی ایک دوسری آیت میں جو ﴿فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ﴾ (التغابن:١٦) ہے' یعنی اللہ سے ڈرو جتنا تمہاری قدرت میں ہے تو حضرت ابن عباسؓ اور طاؤسؒ نے فرمایا کہ یہ درحقیقت ﴿حَقَّ تُقٰتِهٖ﴾ کی ہی تفسیر وتشریح ہے' اور مطلب یہ ہے کہ معاصی اور گناہوں سے بچنے میں اپنی پوری توانائی اور طاقت صرف کر دے تو حق تقویٰ ادا ہو گیا' اگر کوئی شخص اپنی پوری توانائی صرف کرنے کے بعد کسی ناجائز میں مبتلا ہو ہی گیا تو وہ حقوقِ تقویٰ کے خلاف نہیں۔

اگلے جملے میں جو ارشاد فرمایا: ﴿وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ﴾ اس سے معلوم ہوا کہ تقویٰ درحقیقت پورا اسلام ہی ہے' کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی مکمل اطاعت اور اس کی نافرمانی سے مکمل پرہیز کا ہی نام تقویٰ ہے' اور اسی کو اسلام کہا جاتا ہے۔

رہا یہ معاملہ کہ آیت میں حکم یہ ہے کہ تمہاری موت اسلام ہی پر آنی چاہیے' اسلام کے سوا کسی حال پر موت نہ آنی چاہیے۔ تو یہاں یہ شبہ نہ کیا جائے کہ موت تو آدمی کے اختیار میں نہیں' کسی وقت کسی حال میں آسکتی ہے' کیونکہ حدیث میں ہے: ((كَمَا تَحْيَوْنَ تَمُوْتُوْنَ وَكَمَا تَمُوْتُوْنَ تُحْشَرُوْنَ)) یعنی ''جس حالت پر تم اپنی زندگی گزار دو گے اسی پر موت آئے گی' اور جس حالت میں موت آئے گی اسی حالت میں حشر میں کھڑے کیے جاؤ گے''۔ تو جو شخص اپنی پوری زندگی اسلام پر گزارنے کا پختہ عزم رکھتا ہے' اور مقدور بھر اس پر عمل کرتا ہے' اس کی موت ان شاء اللہ اسلام ہی پر آئے گی۔ بعض روایاتِ حدیث میں جو یہ آیا ہے کہ بعض آدمی ایسے بھی ہوں گے کہ ساری عمر اعمالِ صالحہ کرتے ہوئے گزر گئی' آخر میں کوئی ایسا کام کر بیٹھے جس سے سارے اعمال حبط و برباد ہو گئے' یہ ایسے ہی لوگوں کو پیش آسکتا ہے جن کے عمل میں اول اخلاص اور پختگی نہیں تھی۔ واللہ اعلم!



## مسلمانوں کی اجتماعی قوت کا دوسرا اصول: باہمی اتفاق

دوسری آیت ﴿وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا﴾ میں اس کو نہایت بلیغ اور حکیمانہ انداز سے بیان فرمایا ہے' کہ سب سے پہلے وہ اصول اور گر بتلایا جو انسانوں کو باہمی مربوط اور متفق کرنے کا نسخہ اکسیر ہے' اس کے بعد آپس میں متفق ہونے کا حکم دیا' اس کے بعد آپس کے افتراق وانتشار سے منع فرمایا۔

تشریح اس کی یہ ہے کہ اتفاق واتحاد ایک ایسی چیز ہے جس کے محمود ومطلوب ہونے پر دنیا کے تمام انسان' خواہ وہ کسی ملک اور کسی زمانے کے ہوں' کسی مذہب ومشرب سے تعلق رکھتے ہوں' سب کا اتفاق ہے' اس میں دو رائیں ہونے کا امکان ہی نہیں۔ دنیا میں شاید کوئی ایک آدمی بھی ایسا نہ نکلے جو لڑائی جھگڑے کو بذاتہٖ مفید اور بہتر جانتا ہو' اس لیے دنیا کی ہر جماعت' ہر پارٹی لوگوں کو متفق کرنے کی ہی دعوت دیتی ہیں' لیکن دنیا کے حالات کا تجربہ بتلاتا ہے کہ اتفاق کے مفید اور ضروری ہونے پر سب کے اتفاق کے باوجود ہو یہ رہا ہے کہ انسانیت فرقوں' گروہوں' پارٹیوں میں بٹی ہوئی ہے۔ پھر ہر فرقہ کے اندر فرقے اور پارٹی کے اندر پارٹیوں کا لامحدود سلسلہ ایسا ہے کہ صحیح معنی میں دو آدمیوں کا اتحاد واتفاق بھی ایک افسانہ بن کر رہ گیا ہے۔ وقتی اغراض کے تحت چند آدمی کسی بات پر اتفاق کرتے ہیں' اغراض پوری ہو جائیں یا ان میں ناکامی ہو جائے تو نہ صرف یہ کہ اتفاق ختم ہو جائے بلکہ افتراق اور عداوتوں کی نوبت آتی ہے۔

غور کیا جائے تو اس کا سبب یہ معلوم ہوگا کہ ہر گروہ و ہر فرقہ اور ہر شخص لوگوں کو اپنے خودساختہ پروگرام پر متحد ومتفق کرنا چاہتا ہے' اور جبکہ دوسرے لوگ خود اپنا بنایا ہوا کوئی نظام و پروگرام رکھتے ہوں تو وہ ان سے متفق ہونے کی بجائے ان کو اپنے پروگرام پر متحد ہونے کی دعوت دیتے ہیں' اس لیے لازمی طور پر ہر دعوتِ اتحاد کا نتیجہ ایک ہی جماعتوں اور افراد کا افتراق وانتشار نکلتا ہے' اور اختلافات کی دلدل میں پھنسی ہوئی انسانیت کے ہاتھ اس کے سوا کچھ نہیں آتا کہ ع ''مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی!''

اس لیے قرآن حکیم نے صرف اتحاد واتفاق اور تنظیم واجتماع کا وعظ ہی نہیں فرمایا بلکہ اس کے حاصل کرنے اور باقی رکھنے کا ایک ایسا منصفانہ وعادلانہ اصول بھی بتلا دیا جس کے ماننے سے کسی گروہ کو اختلاف نہیں ہونا چاہیے۔ وہ یہ ہے کہ کسی انسانی دماغ یا چند انسانوں کے بنائے

ہوئے نظام و پروگرام کو دوسرے انسانوں پر تھوپ کر ان سے یہ امید رکھنا کہ وہ سب اُس پر متفق ہو جائیں گے عقل و انصاف کے خلاف اور خود فریبی کے سوا کچھ نہیں۔ البتہ ربّ العالمین کا دیا ہوا نظام و پروگرام ضرور ایسی چیز ہے کہ اس پر سب انسانوں کو متفق ہونا ہی چاہیے۔ کوئی عقلمند انسان اس سے اصولاً انکار نہیں کر سکتا۔ اب اگر اختلاف کی کوئی راہ باقی رہتی ہے تو وہ صرف اس بات کے پہچاننے میں ہو سکتی ہے کہ احکم الحاکمین ربّ العالمین کا بھیجا ہوا نظام کیا اور کون سا ہے' یہودی نظامِ تورات کو' نصاریٰ نظامِ انجیل کو خدا تعالیٰ کا بھیجا ہوا واجب التعمیل بتلاتے ہیں' یہاں تک کہ مشرکین کی مختلف جماعتیں بھی اپنی اپنی مذہبی رسوم کو خدا تعالیٰ ہی کی طرف منسوب کرتی ہیں۔

لیکن اوّل تو اگر انسان اپنے جماعتی تعصب اور آبائی تقلید سے ذرا بلند ہو کر اپنی عقل خداداد سے کام لے تو یہ حقیقت بے نقاب ہو کر اس کے سامنے آ جاتی ہے کہ خاتم الانبیاء ﷺ جو اللہ تعالیٰ کا آخری پیام قرآن کی صورت میں لائے ہیں' آج اس کے سوا کوئی نظام خدا تعالیٰ کے نزدیک مقبول نہیں۔ اس سے بھی قطع نظر کیجیے تو اس وقت مخاطب مسلمان ہیں جن کا اس پر ایمان ہے کہ آج قرآن کریم ہی ایک ایسا نظامِ حیات ہے جو بلاشبہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھیجا ہوا ہے' اور چونکہ خود حق تعالیٰ نے اس کی حفاظت کا ذمہ لے لیا ہے اس لیے قیامت تک اس میں کسی قسم کی تحریف و تغییر کا بھی امکان نہیں' اس لیے سرِدست میں غیر مسلم جماعتوں کی بحث کو چھوڑ کر قرآن پر ایمان رکھنے والے مسلمانوں ہی سے کہتا ہوں کہ ان کے لیے تو صرف یہی لائحہ عمل ہے' اگر مسلمانوں کی مختلف پارٹیاں قرآن کریم کے نظام پر متفق ہو جائیں تو ہزاروں گروہی اور نسلی وطنی اختلافات ایک لحظہ میں ختم ہو سکتے ہیں جو انسانیت کی ترقی کی راہ میں حائل ہیں۔ اب اگر مسلمانوں میں کوئی باہمی اختلاف رہے گا تو وہ صرف فہم قرآن اور تعبیر قرآن میں رہ سکتا ہے' اور اگر ایسا اختلاف حدود کے اندر رہے بھی تو نہ وہ مذموم ہے اور نہ انسان کی اجتماعی زندگی کے لیے مضر' بلکہ ایسا اختلافِ رائے عقلاء کے درمیان رہنا فطری امر ہے' سو اس پر قابو پانا اور حدود کے اندر رکھنا کچھ دشوار نہیں' بخلاف اس کے کہ قرآنی نظام سے آزاد ہو کر ہماری پارٹیاں لڑتی رہیں تو اس وقت خلاف و جدال کا کوئی علاج نہیں رہتا' اور اسی اختلاف و انتشار کو قرآن کریم نے سختی کے ساتھ منع فرمایا ہے' اور آج اسی قرآنی اصول کو نظر انداز کر دینے کی وجہ



سے ہماری پوری ملت انتشار و افتراق میں پھنس کر برباد ہو رہی ہے۔ قرآن کریم کی آیت مذکورہ میں اس افتراق کو مٹانے کا نسخۂ اکسیر اس طرح بتلایا ہے:

﴿ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا ﴾

''یعنی اللہ کی رسّی کو سب مل کر مضبوط تھامو۔''

اللہ کی رسّی سے مراد قرآن مجید ہے۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا: ((كِتَابُ اللّٰهِ هُوَ حَبْلُ اللّٰهِ الْمَمْدُوْدُ مِنَ السَّمَاءِ اِلَى الْاَرْضِ)) یعنی ''کتاب اللہ اللہ تعالیٰ کی رسی ہے جو آسمان سے زمین تک لٹکی ہوئی ہے''۔ (ابن کثیر) زید بن ارقم رضی اللہ عنہ کی روایت میں ''حَبْلُ اللّٰهِ هُوَ الْقُرْآن'' کے الفاظ آئے ہیں۔ (ابن کثیر) محاورۂ عربی میں حَبل سے مراد عہد بھی ہوتا ہے اور مطلقاً ہر وہ شے جو ذریعہ یا وسیلہ کا کام دے سکے۔ قرآن کو یا دین کو رسی سے اس لیے تعبیر کیا گیا کہ یہی وہ رشتہ ہے جو ایک طرف اہل ایمان کا تعلق اللہ تعالیٰ سے قائم کرتا ہے اور دوسری طرف تمام ایمان لانے والوں کو باہم ملا کر ایک جماعت بناتا ہے۔

حاصل یہ ہے کہ قرآن کے اس ایک جملہ میں حکیمانہ اصول بتلائے گئے۔ ایک یہ کہ ہر انسان پر لازم ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے نظامِ حیات یعنی قرآن پر مضبوطی سے عامل ہو۔ دوسرے یہ کہ سب مسلمان مل کر اس پر عمل کریں' جس کا نتیجہ لازمی یہ ہے کہ مسلمان سب باہم متفق و متحد اور منظّم ہو جائیں' جیسے کوئی جماعت ایک رسی کو پکڑے ہوئے ہو تو پوری جماعت ایک جسمِ واحد بن جاتی ہے۔ قرآن کریم نے ایک دوسری آیت میں اس کو اور زیادہ واضح اس طرح بیان فرمایا ہے:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا ﴿٩٦﴾﴾ (مریم)

''یعنی جو لوگ ایمان لائیں اور نیک عمل کریں اللہ تعالیٰ ان کے آپس میں دوستی و محبت پیدا فرما دیتے ہیں۔''

پھر اس میں ایک لطیف تمثیل بھی ہے کہ مسلمان جب اللہ کی کتاب سے اعتصام کر رہے ہوں تو اس کی مثال اس حالت جیسی ہے جو کسی بلندی پر چڑھتے وقت ایک مضبوط رسی کو پکڑ لیں' اور ہلاکت سے محفوظ رہیں' لہٰذا اشارہ فرمایا کہ اگر سب مل کر اس کو پوری قوت سے پکڑے رہو گے' کوئی شیطان شر انگیزی میں کامیاب نہ ہو سکے گا' اور انفرادی زندگی کی طرح مسلم قوم کی اجتماعی قوت بھی غیر متزلزل اور ناقابلِ تسخیر ہو جائے گی۔ قرآن کریم سے تمسک کرنا ہی وہ چیز ہے جس سے بکھری ہوئی قوتیں

جمع ہوتی ہیں اور ایک مردہ قوم حیاتِ تازہ حاصل کر لیتی ہے' اور اس سے ہٹ کر ان کی قومی و اجتماعی زندگی تو تباہ ہو ہی جائے گی اور اس کے بعد انفرادی زندگی کی بھی کوئی خیر نہیں۔

## پوری مسلم قوم کا اتفاق صرف اسلام ہی کی بنیاد پر ہوسکتا ہے' نسبی اور وطنی وحدت سے یہ کام نہیں ہوسکتا

یہاں سب سے پہلے یہ جاننا لازمی ہے کہ وحدت و اتفاق کے لیے ضروری ہے کہ اس وحدت کا کوئی خاص مرکز ہو۔ پھر مرکز وحدت کے بارے میں اقوامِ عالم کی راہیں مختلف ہیں' کہیں نسلی اور نسبی رشتوں کو مرکز وحدت سمجھا گیا' جیسے قبائل عرب کی وحدت تھی کہ قریش ایک قوم اور بنو تمیم دوسری قوم سمجھی جاتی تھی' اور کہیں رنگ کا امتیاز اس وحدت کا مرکز بن رہا تھا کہ کالے لوگ ایک قوم اور گورے دوسری قوم سمجھے جاتے' کہیں وطنی اور لسانی وحدت کو مرکز اتحاد بنایا ہوا تھا' کہ ہندی ایک قوم اور عربی دوسری قوم' کہیں آبائی رسوم و رواج کو مرکز وحدت بنایا گیا تھا' کہ جو ان رسوم کے پابند ہیں وہ ایک قوم اور جو ان کے پابند نہیں وہ دوسری قوم' جیسے ہندوستان کے ہندو اور آریہ سماج وغیرہ۔

قرآن کریم نے ان سب کو چھوڑ کر مرکز وحدت حبل اللہ قرآن کریم کو یعنی اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے نظام محکم کو قرار دیا' اور دوٹوک فیصلہ کر دیا کہ مؤمن ایک قوم ہے جو حبل اللہ سے وابستہ ہے' اور کافر دوسری قوم جو اس حبل متین سے وابستہ نہیں' ﴿خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَّمِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ﴾ (التغابن:۲) کا یہی مطلب ہے۔ جغرافیائی وحدتیں ہرگز اس قابل نہیں کہ ان کو مرکز وحدت بنایا جائے' کیونکہ وہ وحدتیں عموماً غیر اختیاری امور ہیں' جن کو کوئی انسان اپنے سعی و عمل سے حاصل نہیں کر سکتا' جو کالا ہے وہ گورا نہیں ہوسکتا' جو قریشی ہے وہ تمیمی نہیں بن سکتا' جو ہندی ہے وہ عربی نہیں بن سکتا' اس لیے ایسی وحدتیں بہت ہی محدود دائرہ میں ہوسکتی ہیں' ان کا دائرہ کبھی اور کہیں پوری انسانیت کو اپنی وسعت میں لے کر پوری دنیا کو ایک وحدت پر جمع کرنے کا دعویٰ کر ہی نہیں سکتا' اس لیے قرآن کریم نے مرکز وحدت حبل اللہ یعنی قرآن اور خدا تعالیٰ کے بھیجے ہوئے نظامِ حیات کو بنایا' جس کا اختیار کرنا اختیاری امر ہے۔ کوئی مشرق کا رہنے والا ہو یا مغرب کا' گورا ہو یا کالا' عربی زبان بولتا ہو یا ہندی و انگریزی' کسی قبیلہ کسی خاندان کا



ہو' ہر شخص اس معقول اور صحیح مرکز وحدت کو اختیار کر سکتا ہے' اور دنیا بھر کے پورے انسان اس مرکز وحدت پر جمع ہو کر بھائی بھائی بن سکتے ہیں۔ اور اگر وہ آبائی رسم و رواج سے ذرا بلند ہو کر غور کریں تو ان کو اس کے سوا کوئی معقول اور صحیح راہ ہی نہ ملے گی' کہ خدا تعالیٰ کے بھیجے ہوئے نظام کو پہچانیں' اور اس کا اتباع کر کے حبل اللہ کو مضبوطی سے تھام لیں' جس کا نتیجہ ایک طرف یہ ہوگا کہ پوری انسانیت ایک مضبوط و مستحکم وحدت سے مربوط ہو جائے گی۔

دوسرا یہ کہ اس وحدت کا ہر فرد اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے نظام کے مطابق اپنے اعمال و اخلاق کی اصلاح کر کے اپنی دنیوی اور دینی زندگی کو درست کر لے گا۔ یہ وہ حکیمانہ اصول ہے جس کو لے کر ایک مسلمان ساری دنیا کی اقوام کو للکار سکتا ہے' کہ یہی صحیح راستہ ہے' اس طرف آؤ۔ اور مسلمان اس پر جتنا بھی فخر کریں بجا ہے' لیکن افسوس ہے کہ یورپ والوں کی گہری سازش جو اسلامی وحدت کو پارہ پارہ کرنے کے لیے صدیوں سے چل رہی ہے وہ خود اسلام کے دعوے داروں میں کامیاب ہوگئی۔ اب امت اسلامیہ کی وحدت عربی' مصری' ہندی' سندھی میں بٹ کر پارہ پارہ ہوگئی۔ قرآن کریم کی یہ آیت ہر وقت اور ہر جگہ ان سب کو بآوازِ بلند یہ دعوت دے رہی ہے کہ یہ جاہلانہ امتیازات درحقیقت امتیازات ہیں اور نہ ان کی بنیاد پر قائم ہونے والی وحدت کوئی معقول وحدت ہے' اس لیے اعتصام بحبل اللہ کی وحدت اختیار کریں' جس نے ان کو پہلے بھی ساری دنیا میں غالب اور فائق اور سربلند بنایا' اور اگر پھر ان کی قسمت میں کوئی خیر مقدر ہے تو وہ اسی راستہ سے مل سکتی ہے۔

الغرض اس آیت میں مسلمانوں کو دو ہدایتیں دی گئی ہیں' اوّل یہ کہ اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے نظامِ حیات کے پابند ہو جائیں۔ دوسرے یہ کہ سب مل کر مضبوطی کے ساتھ اس نظام کو تھام لیں' تاکہ ملّتِ اسلامی کا شیرازہ خود بخود منظّم ہو جائے' جیسا کہ اسلام کے قرونِ اولیٰ میں اس کا مشاہدہ ہو چکا ہے۔ مسلمانوں میں اتفاق کے ایجابی پہلو کی وضاحت کے بعد فرمایا: ﴿وَّلَا تَفَرَّقُوْا﴾ باہم نااتفاقی نہ کرو۔ قرآن حکیم کا یہ حکیمانہ انداز ہے کہ وہ جہاں ایجابی پہلو واضح کرتا ہے وہیں سلبی پہلو سے مخالف چیزوں سے منع فرماتا ہے' چنانچہ ایک دوسری آیت میں ارشاد فرمایا: ﴿وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ۚ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ ۭ﴾ (الانعام:۱۵۳) اس آیت میں بھی صراطِ مستقیم پر قائم رہنے کی تلقین ہے' اور اپنی

خواہشات کے زیر اثر خود ساختہ راستوں پر چلنے کی ممانعت۔ نا اتفاقی کسی قوم کی ہلاکت کا سب سے پہلا اور آخری سبب ہے' اس لیے قرآن حکیم نے بار بار مختلف اسالیب میں اس کی ممانعت فرمائی ہے۔ ایک دوسری آیت میں فرمایا:

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ فَرَّقُوْا دِیْنَهُمْ وَ كَانُوْا شِیَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِیْ شَیْءٍ ؕ﴾ (الانعام:۱۵۹)

''یعنی جن لوگوں نے اپنے دین میں تفرقے ڈالے اور مختلف پارٹیوں میں تقسیم ہو گئے آپؐ کا ان سے کوئی تعلق اور کوئی واسطہ نہیں۔''

علاوہ ازیں انبیاء علیہم السلام کی امتوں کے واقعات کو نقل فرمایا کہ کس طرح وہ امتیں باہمی اختلاف و شقاق کے باعث مقصدِ حیات سے منحرف ہو کر دنیا و آخرت کی رسوائیوں میں مبتلا ہو چکی ہیں۔ حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے تین چیزوں کو پسند فرمایا ہے اور تین چیزوں کو ناپسند۔ پسندیدہ چیزیں یہ ہیں: اوّل یہ کہ تم عبادت اللہ تعالیٰ کے لیے کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ۔ دوم یہ کہ اللہ تعالیٰ کی کتاب کو مضبوطی سے تھامو' اور نا اتفاقی سے بچو۔ سوم یہ کہ اپنے حکام اور اولوالامر کے حق میں خیر خواہی کا جذبہ رکھو۔ اور وہ تین چیزیں جن سے اللہ تعالیٰ ناراض ہوتے ہیں' یہ ہیں: (۱) بے ضرورت قیل و قال اور بحث و مباحثہ (۲) بلاضرورت کسی سے سوال کرنا (۳) اضاعت مال (ابن کثیر عن ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ)

اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ کیا ہر اختلاف مذموم ہے' یا کوئی اختلاف غیر مذموم بھی ہے۔ جواب یہ ہے کہ ہر اختلاف مذموم نہیں ہے' بلکہ مذموم وہ اختلاف ہے کہ جس میں اپنی اہواء اور خواہشات کی بنا پر قرآن سے دور رہ کر سوچا جائے۔ لیکن اگر قرآن پر مجتمع رہتے ہوئے اور حضور اکرم ﷺ کی تشریح و تفصیل کو قبول کرتے ہوئے اپنی فطری استعداد اور دماغی صلاحیتوں کی بناء پر فروع میں اختلاف کیا جائے تو یہ اختلاف فطری ہے' اور اسلام اس سے منع نہیں کرتا۔ صحابہ و تابعین اور ائمہ فقہاء کا اختلاف اسی قسم کا اختلاف تھا' اور اسی اختلاف کو رحمت قرار دیا گیا۔ ہاں اگر انہی فروعی بحثوں کو اصلِ دین قرار دیا جائے اور ان میں اختلاف کو جنگ و جدل اور سب و شتم کا ذریعہ بنا لیا جائے تو یہ بھی مذموم ہے۔ باہمی اتحاد کے ان دونوں پہلوؤں کو واضح کرنے کے بعد اس حالت کی طرف اشارہ کیا گیا جس میں اسلام سے پہلے اہلِ عرب مبتلا تھے۔ قبائل کی باہمی عداوتیں' بات بات پر ان کی لڑائیاں اور شب و روز کے کشت و خون کی بدولت قریب تھا کہ پوری عرب قوم نیست و نابود ہو جاتی۔ اس آگ میں جل مرنے سے اگر



کسی چیز نے انہیں بچایا تو وہ یہی نعمت اسلام تھی' چنانچہ فرمایا گیا:

﴿وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖۤ اِخْوَانًا ۚ وَ كُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا ؕ﴾ (آل عمران:۱۰۳)

''یعنی اللہ کا یہ انعام اپنے اوپر یاد رکھو کہ جب تم باہم دشمن تھے تو اس نے تمہارے قلوب میں الفت ڈال دی' سو تم اس کے انعام سے آپس میں بھائی بھائی بن گئے' اور تم دوزخ کے گڑھے کے کنارے پر تھے' سو اُس نے تمہیں اس سے بچا لیا۔''

یعنی صدیوں کی عداوتیں اور کینے نکال کر خدا تعالیٰ نے اسلام اور نبی کریم ﷺ کی برکت سے بھائی بھائی بنا دیا' جس سے تمہارے دین و دنیا درست ہو گئے اور ایسی دوستی قائم ہو گئی جسے دیکھ کر تمہارے دشمن مرعوب ہوئے' اور یہ برادرانہ اتحاد خدا کی اتنی بڑی نعمت ہے جو روئے زمین کا خزانہ خرچ کر کے بھی میسر نہ آ سکتی تھی۔ واقعہ شانِ نزول میں شریر لوگوں نے جو اوس و خزرج کے قبیلوں کو پچھلی جنگ یاد دلا کر فساد برپا کرنا چاہا تھا آیت مذکورہ میں اس کا مکمل علاج ہو گیا' نتائج اور بذریعہ اسلام ان سے رہائی کا بیان فرما دیا۔

## مسلمانوں کا باہمی اتحاد اللہ تعالیٰ کی اطاعت پر موقوف ہے

قرآن حکیم کے اس ارشاد سے ایک اور حقیقت کا انکشاف ہوا' وہ یہ کہ دلوں کا مالک درحقیقت اللہ جل شانہ ہے' دلوں کے اندر محبت یا نفرت پیدا کرنا اسی کا کام ہے' کسی جماعت کے قلوب میں باہمی محبت اور مودت پیدا کرنا خالص انعامِ خداوندی ہے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کا انعام صرف اس کی اطاعت و فرمانبرداری ہی سے حاصل ہو سکتا ہے' معصیت و نافرمانی کے ساتھ یہ انعام نہیں مل سکتا۔

اس کا نتیجہ یہ بھی ہوا کہ اگر مسلمان مستحکم تنظیم و اتحاد چاہتے ہیں تو اس کا ذریعہ فقط یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت و فرمانبرداری کو اپنا شعار بنا لیں۔ اسی طرف اشارہ کرنے کے لیے آیت کے آخر میں ارشاد فرمایا ہے کہ ﴿كَذٰلِكَ یُبَیِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰیٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۱۰۳﴾﴾ یعنی اسی طرح اللہ تعالیٰ تم لوگوں کے لیے حقائق واضح کر کے بیان فرماتے ہیں تاکہ تم لوگ صحیح راہ پر رہو۔

❁❁❁

# قرآن مجید: انسانیت کی ضرورت

حافظ محمد مشتاق ربانی

قرآن مجید ایک مسلسل معجزہ ہے اور یہ ہر دور کے مسلمانوں کی بنیادی ضرورت ہے۔ اس سے تمسک کی صورت میں ہی ہم محفوظ رہ سکتے ہیں' ورنہ اس قدر فتنے ہیں کہ مسلمان کا محفوظ رہنا ناممکن ہے۔ یہ صحیح معنوں میں 'العروۃ الوثقیٰ' ہے جس کے ذریعے سے ہم ہر شر سے بچ سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس کا نزول ہی اس لیے کیا ہے تا کہ ہم ہر طرح کی گمراہی اور برائیوں سے محفوظ رہیں۔ اس فصیح و بلیغ کتاب کو سیکھنا ایک سعادت ہے۔ اس کی تشریح اور وضاحت کے لیے حدیث نبوی ہے۔ رسول مکرم ﷺ ہی قرآن مجید کے شارح ہیں اور آپؐ نے اپنی ہر ادا سے اس کی وضاحت کی ہے۔ قرآن مجید کی وضاحت میں بعض علماء و مفکّرین کی خدمات بھی قابل قدر ہیں' لیکن یہ یاد رہے کہ علماء کرام نے جو تشریح کی ہے، ان کی اس تشریح میں حدیث نبوی نے بنیادی کردار ادا کیا۔

آج ہم اس عظیم کتاب سے دور ہو چکے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اس کتاب کی طرف رجوع کریں۔ خاص طور پر ہم عجمی لوگوں کو اس کے معانی و مطالب پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ اس کے مطالعہ کے دوران الٹے سیدھے فلسفے میں نہیں جانا چاہیے۔ بالکل خالیُ الذہن ہو کر اس کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ اس کی زبان عربی مبین ہے جو کہ ایک بے مثل زبان ہے۔ عربی سامی زبانوں میں سے ایک اہم زبان ہے۔ سامی زبانوں میں سے دوسری زبان عبرانی بھی موجود ہے لیکن جو وسعت عربی زبان میں ہے' وہ عبرانی میں نہیں ہے۔ عربی کی زندگی قرآن سے وابستہ ہے اور قرآن نے عربی کو ہمیشہ کی زندگی عطا کی ہے۔ گویا اس کی تروتازگی قرآن سے منسلک ہے۔ کسی کا یہ قول بالکل درست ہے: لو لا القرآن لما کانت العربیہ کہ اگر قرآن نہ ہوتا تو عربی نہ رہتی۔ ہمارے لیے عربی زبان اس لیے محترم ہے کہ یہ قرآن اور رسول ہاشمی ﷺ کی زبان مبارک ہے۔ جو لوگ عربی نہیں جانتے انہیں عربی سیکھنی



چاہیے تا کہ وہ قرآن پڑھ سکیں اور سمجھ سکیں۔

اس وقت انسانیت در بدر کی ٹھوکریں کھا رہی ہے۔ ان کا چارہ گر صرف اسلام اور قرآن ہے اور انسان فکر و نظر میں گمراہی کا شکار ہے۔ اسے سمجھ نہیں آ رہی کہ اس دلدل سے کیسے نکلا جائے' جبکہ اللہ نے اپنا پیارا کلام اتارا ہے اب اس سے ہدایت اخذ کرنا انسان کا اپنا فعل ہے۔ ہر دور میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے انسانوں کی ہدایت کا انتظام کیا ہے اور آخر میں اللہ نے اپنی کتاب قرآن مجید حضرت محمد خاتم النبیین ﷺ پر نازل کی' تا کہ قیامت تک آنے والے لوگ رسول اور کتاب کے ذریعے سے اپنی زندگی سنوار سکیں۔ قرآن صرف مسلمانوں کے لیے نہیں بلکہ یہ ھدی للناس ہے اور اس میں بنی نوع انسان کے لیے ہدایت موجود ہے۔ قرآن مجید میں کئی مقامات پر یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ کا صیغہ استعمال ہوا ہے۔ سورۃ النساء اور سورۃ الحج کا آغاز یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ سے ہوتا ہے۔ سورۃ یونس میں ارشاد ہے: ﴿یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْکُمْ مَّوْعِظَۃٌ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوْرِ وَھُدًی وَّرَحْمَۃٌ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ﴾ ''اے لوگو تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے ایک نصیحت آئی ہے جو تمہارے سینوں کی بیماریوں کے لیے شفا ہے اور وہ ایمان والوں کے لیے ہدایت اور رحمت ہے۔''

قرآن مجید اس پہلو سے بھی انسانیت کی ضرورت ہے کہ یہ علم کا ایک مستند ذریعہ ہے۔ انسانی زندگی کے تمام پہلو اس میں مفصل طور پر بیان کیے گئے ہیں۔ یہ تاریخ پر بڑی عمدگی سے روشنی ڈالتا ہے۔ قرآن مجید میں جو تاریخی قصص نقل کیے گئے ہیں وہ کسی اور ذریعے سے صحیح طور پر معلوم نہیں ہو سکتے تھے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے بارے پوری سورت ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصہ کو کھول کر بیان کیا گیا ہے۔ یہ قرآن کا اعجاز ہے کہ اس نے واقعات کی شکل میں ٹھیک ٹھیک خبر دی ہے۔ قرآن اگرچہ سائنس کی کتاب نہیں ہے لیکن اس میں سائنسی اشارے موجود ہیں جو تحقیقات میں معاون ہو سکتے ہیں۔ تخلیق کائنات کے بارے میں کئی اشارات موجود ہیں جو سائنسدانوں کے لیے تحقیق میں معاون ہیں۔ انسانی تخلیق کا بیان ایک معجزہ ہے۔

قرآن مجید میں زندگی گزارنے کا ایسا نظام متعارف کرایا گیا ہے جو ہر طرح کی اونچ نیچ اور افراط و تفریط سے پاک ہے۔ اس کے علاوہ قرآن مجید میں معاشیات کے باب میں اہم اصول بیان کر دیے گئے ہیں۔ اب یہ مسلمان ماہرین معاشیات کی ذمہ داری ہے کہ وہ ان اصولوں کی روشنی میں تحقیق کو آگے بڑھائیں۔ علمی حوالے سے اگر کوئی قرآن کے کسی بیان پر

تنقید کرنے کی کوشش کرے گا تو اس کی تنقید اہل دنیا کی نظر میں بے معنی ہو کر رہے گی اور وہ الٹا رسوا ہوگا۔ قرآن حکیم کے ذریعے سے مابعد الموت کے حقائق سامنے آتے ہیں۔ اخلاقیات کا علم اس سے حاصل ہوتا ہے۔ قرآن جس کو اخلاق کہے گا وہی عمل اخلاق کہلائے گا۔ کسی پہلو میں اس کو چیلنج نہیں کیا جاسکتا۔ کوئی اس جیسا کلام نہیں اور یہ سب سے بالاتر کلام ہے۔ ہر دولت اس کے سامنے ہیچ ہے۔ یہ گوہر نایاب ہے۔ اس میں صداقت کے علاوہ کچھ نہیں۔ تمام توہمات اور روحانی امراض کا علاج اس میں ہے۔

علم بنیادی طور پر دو طرح کا ہے۔ ایک علم وحی ہے اور دوسرا انسانی علم ہے جو مشاہدات وتجربات اور عقل وشعور سے حاصل ہوتا ہے۔ یہ دونوں انسان کی ضرورت ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ تعمیر ارض کے لیے انسانی علم کی ضرورت ہے۔ اسی علم کی بنیاد پر ادارے بنے ہیں' سائنسی ترقی ہوئی ہے' لیکن خود انسان وحی کے علم کے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتے۔ انہیں زندگی گزارنے کا سلیقہ وحی سے معلوم ہوگا اور وحی کا علم ہمارے پاس قرآن وحدیث کی شکل میں ہے۔ انسانی علم بھی اصلاً وحی کے بغیر ادھورا ہے۔ انسانی علم کے صحیح اور غیر صحیح ہونے کا علم بھی وحی سے معلوم ہوگا۔ وحی ہی ہر شک اور ریب سے مبرا ہے۔ ہمارے پاس قرآن کی شکل میں محفوظ وحی موجود ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی آسمانی کتابیں ہیں لیکن وہ تحریف کا شکار ہیں۔ قرآن مجید حقیقت میں ان کی محافظ ہے۔ وہ امور جن میں تحریف کی گئی' قرآن ان کو اصل شکل میں پیش کرتا ہے۔ قرآن کا ایک نام مھیمن ہے یعنی دوسری کتابوں پر نگران۔ دیگر آسمانی کتابوں پر قرآن کا احسان ہے کہ اس نے ان کی تعلیمات کو ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا ہے۔

اس وقت دنیا میں جنگ وجدل جاری ہے۔ طاقت ور قومیں کمزور ملکوں کو اپنی غلامی میں رکھنا چاہتی ہیں۔ پوری دنیا میں فساد برپا ہے۔ یہ واحد کتاب ہے جو امن کی ضامن ہے۔ اہلِ دنیا شاید اس کو دہشت گردی کا موجب سمجھتی ہو لیکن امرِ واقعہ یہ ہے کہ یہ امن کی کتاب ہے۔ یہ عدوان اور سرکشی سے روکتی ہے۔ کسی بے گناہ کے خون بہانے کو گناہ کبیرہ قرار دیتی ہے۔ ہر ایک کی عزت وناموس کا خیال رکھنے کی تعلیم دیتی ہے۔ اگر امن وعدل کے راستے میں کوئی قوت مزاحم ہو تو اس کو ہٹانے کے لیے جہاد وقتال کا حکم دیتی ہے۔ کیونکہ سرکشی کے خاتمہ کے لیے جہاد ناگزیر ہے۔ جہاد کے بارے کئی غلط فہمیاں پیدا کر دی گئی ہیں۔ ان غلط فہمیوں کو دور کرنا ضروری ہے۔ جہاد وقتال کی تفہیم قرآن سے ہی معلوم ہوگی۔ جہاد کے موضوع کو قرآن حکیم میں



وضاحت سے بیان کیا ہے۔ کئی سورتوں کا موضوع ہی صرف جہاد ہے۔ سورۃ الصّف' سورۃ الانفال' سورۃ التوبہ اور سورۃ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا موضوع جہاد وقتال ہے۔

قرآن کے جہاں بہت سے نام ہیں تو ان میں سے ایک نام نور ہے۔ گویا یہ معاشرے کے لیے روشنی ہے۔ یہ انسان کے باطن کو روشن کرنے والی ہے۔ اس سے جہالت کا خاتمہ ہوتا ہے۔ اس کے مطالعہ سے انسان روشن خیال ہوتا ہے۔ اس کے اندر برداشت پیدا ہوتی ہے۔ فہمِ قرآن کی بدولت وہ دوسروں کی آراء کو بھی مقام دینے کے لیے تیار ہوتا ہے۔ جدید تعلیم میں جو کج روی پائی جاتی ہے اس کی اصلاح اس سے ممکن ہے۔ آج کا انسان طرح طرح کے نظریات میں جکڑا ہوا ہے۔ اس کی یہ ذہنی غلامی صرف مطالعہ قرآن سے ختم ہوسکتی ہے۔ لوگ اگر دماغی طور پر راحت اور سکون چاہتے ہیں تو وہ قرآن کے مطالعہ کو معمول بنائیں۔ اللہ کے ذکر کی ایک اہم شکل قرآن ہے اور ذکرِ الٰہی قلوب کو سکون پہنچاتا ہے۔ بعض لوگ اپنے مسائل کے حل کے لیے روزانہ صرف چند مخصوص سورتیں تلاوت کرتے ہیں۔ انہیں چاہیے باقی قرآن بھی پڑھیں اس لیے کہ سارا قرآن ہی شفا ہے۔ اس کا ایک ایک حرف باعث برکت ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض سورتیں اپنی فضلیت کے اعتبار سے اہم ہیں' لیکن ایسا نہ ہو کہ باقی قرآن کی تلاوت ومطالعہ سے محروم رہا جائے۔ ہر سورت کا ایک اپنا موضوع ہے جس سے دوسری سورت خالی ہے۔ سورۃ الفلق اور سورۃ الناس ایک جیسی سورتیں دکھائی دیتی ہیں' لیکن پہلی سورت میں بیرونی حملوں کا ذکر ہے اور دوسری سورت میں انسان کے اندرونی حملہ آور کا ذکر ہے، یعنی اس کا نفس اور شیطان جو وسوسہ اندازی کرتا ہے۔

قرآن مجید تمام انسانوں کی ضرورت ہے لیکن سب سے زیادہ اس وقت خود مسلمانوں کی ضرورت ہے کہ وہ آگے بڑھیں اور قرآن کو حرزِ جان بنائیں۔ تمام علوم پر اس کو مقدم رکھیں اور اس پر تدبّر کریں۔ مسلمانوں کی اکثریت صرف تلاوت سے تعلق رکھتی ہے۔ وہ بھی سعادت سے خالی نہیں ہے لیکن اس کو سمجھنا بھی چاہیے۔ یہ اللہ رب العزت کی جانب سے ایک پیغام ہے جس میں کامیابی پوشیدہ ہے۔ اس سے انحراف ذلت ورسوائی کا سبب ہے اور ذلت بھی ایسی جو دونوں جہانوں میں ملے گی۔ الغرض قرآن پر عمل ہی اصل میں بنیادی کام ہے۔

اللہ تعالیٰ صحیح معنوں میں ہمیں قرآن سے تعلق قائم کرنے' اس کو سمجھ کر پڑھنے' اس کی تعلیمات پر عمل کرنے اور اس کے اصولوں کے مطابق زندگیاں گزارنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین یارب العالمین!

# اہلِ ایمان کے لیے خلود فی النار

## پروفیسر محمد یونس جنجوعہ صاحب کا مکتوب

مدیر محترم —— السلام علیکم ورحمۃ اللہ

میثاق ماہِ اپریل ۲۰۱۷ء میں ایک مضمون بعنوان ''قاریٔ قرآن کے امکانی سوالات اور ان کے جوابات'' شائع ہوا ہے۔ صاحب مضمون نے جہنمیوں کے لیے خلود فی النار کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''کچھ عقلیت پسند اہلِ ظواہر کو غلط فہمی ہوئی اور انہوں نے یہ مفہوم نکال لیا کہ جہنمیوں کا عذاب لامتناہی نہیں ہوگا بلکہ اپنے گناہوں کی سزا بھگت کر آخر نجات پا جائیں گے اور یہ رائے بعض ائمہ نے بھی اختیار کر لی.....'' حالانکہ قرآن وحدیث کی روشنی میں کفار کے لیے خلود فی النار ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہے' مگر بدعمل اہلِ ایمان تو ہمیشہ کے لیے دوزخ میں نہ رہیں گے بلکہ اپنے گناہوں کی سزا بھگت کر جنت میں داخل ہوں گے۔ اس بات پر رسول اللہ ﷺ کے ارشادات شاہد ہیں اور اسی بنا پر راسخ العلم ائمہ اسلام نے بھی بداعمال اہلِ ایمان کے متعلق یہ بتایا ہے کہ وہ اپنے گناہوں کی سزا کے مقدار دوزخ میں رہیں گے اور پاک صاف ہو کر جنت میں داخل ہوں گے۔

حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ محمد ﷺ کی شفاعت کے ذریعے سے ایک گروہ دوزخ سے نکلے گا اور جنت میں داخل ہو جائے گا' ان کا نام جہنم والے رکھا جائے گا (بخاری) ظاہر ہے یہ لوگ اہل ایمان گناہگار ہوں گے' کیونکہ حضور ﷺ کی شفاعت تو صرف مؤمنوں کے لیے ہوگی۔

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''مؤمن دوزخ سے چھٹکارا پائیں گے تو انہیں ایک پُل پر روک لیا جائے گا' جو جنت اور دوزخ کے درمیان ہوگا' پھر انہیں ایک دوسرے سے بدلہ دلایا جائے گا ان مظالم کا جو انہوں نے دنیا میں ایک دوسرے پر کیے ہوں گے۔ یہاں تک کہ جب وہ پاک صاف ہو جائیں گے تو انہیں جنت میں



داخل ہونے کی اجازت مل جائے گی۔ پس مجھے اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں محمد ﷺ کی جان ہے کہ تم میں سے ہر شخص اپنے جنت والے گھر کے راستے کو اپنے دنیا والے گھر کے راستے کی نسبت زیادہ جانتا ہوگا۔'' (بخاری)

اس مضمون کی اور بھی احادیث ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ ہمیشہ کی جہنم ان کے لیے ہوگی جن کی موت اس حال میں ہوئی کہ وہ کافر تھے' ورنہ گناہگار مسلمان تو گناہوں کی سزا پا کر جنت میں چلے جائیں گے۔ یہی اہلِ سُنّت والجماعۃ کا عقیدہ ہے۔ ائمہ اہلِ سنت نے یہ رائے قرآن وسنت کی بنیاد پر اختیار کی ہے' نہ کہ ''کچھ عقلیت پسند اہلِ ظواہر'' سے متاثر ہو کر۔

نیز اس مضمون میں صاحب مضمون نے علمی نکات پر اختلاف کرتے ہوئے طنز وتعریض کا اسلوب اختیار کیا ہے' جو میثاق جیسے سنجیدہ علمی جریدے کے شایانِ شان محسوس نہیں ہوتا۔

والسلام

محمد یونس جنجوعہ

---

## بقیہ: اصلاحِ معاشرہ کا انقلابی تصور

یہ قرآن آپؐ کا پہلا آلۂ جہاد ہے' یہ وہ پہلی شمشیر ہے جو ذہنوں کو تسخیر کرے گی۔ نظریات کو 'افکار کو' عقائد کو' خیالات کو اور تصورات کو اسلام کے رُخ پر لانے والی چیز یہی قرآن مجید ہے۔ بقول مولانا حالی مرحوم ؎

اتر کر حرا سے سوئے قوم آیا
اور اِک نسخہ کیمیا ساتھ لایا

علامہ اقبال مرحوم نے اسی بات کو یوں بیان کیا ؎

در شبستانِ حرا خلوت گزید
قوم و آئین و حکومت آفرید

قرآن سے ساری دعوت وتبلیغ' اسی سے تبشیر وانذار اور اسی سے موعظت ونصیحت' یہ سارا عمل ﴿جَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا۝﴾ ہے۔ یاد رکھیے کہ تصادم سب سے پہلے نظریاتی سطح پر ہوتا ہے اور کشمکش جب بھی ہوگی اس کا پہلا ہدف نظریات' افکار اور عقائد ہوں گے۔

(جاری ہے)

# الاقتِصاد فِی العِبادة

پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

اللہ تعالیٰ نے جو کام انسان کے لیے پسند کیے ہیں ان میں سادگی اور آسانی رکھی ہے۔ قرآنِ مجید میں ارشاد ہے: ﴿یُرِیْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْیُسْرَ وَلَا یُرِیْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ﴾ (البقرۃ:۱۸۵) ''اللہ تعالیٰ تمہارے لیے آسانی چاہتا ہے اور تنگی نہیں چاہتا''۔ اللہ تعالیٰ رحمٰن اور رحیم ہے۔ اس کی تمام صفات لامحدود ہیں مگر رحمت کا ذکر خصوصی ہے۔ قرآن مجید میں فرمایا: ﴿رَحْمَتِیْ وَسِعَتْ كُلَّ شَیْءٍ﴾ (الاعراف:۱۵۶) ''میری رحمت ہر شے پر وسیع ہے''۔ اللہ تعالیٰ خالق ہے۔ اُس نے انسان کو پیدا کیا' وہ اس کی صلاحیتوں کو جانتا ہے اور خود فرماتا ہے: ﴿خُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِیْفًا﴾ (النساء) ''انسان کمزور پیدا کیا گیا ہے''۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کے لیے جو اعمال لازم کیے ہیں ان میں اس کی اس کمزوری کو مدنظر رکھا گیا ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے: ﴿لَا یُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا﴾ (البقرۃ:۲۸۶) ''اللہ تعالیٰ کسی شخص کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا''۔ یہی وجہ ہے کہ تمام لازمی امور میں آسانی کا پہلو رکھا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کو عبادات پسند ہیں' مگر کوئی شخص عبادات میں مبالغہ کرتا ہے تو اسے اس سے روکا گیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ اللہ کے بندے تھے' انہیں عبادت نہایت مرغوب تھی' لیکن ان کو بھی روک دیا گیا کہ وہ ساری رات جاگ کر نوافل پڑھنے میں گزاریں۔ سورۃ المزمل کے آغاز میں فرمایا: ﴿قُمِ الَّیْلَ اِلَّا قَلِیْلًا ۝۲ نِّصْفَهٗٓ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِیْلًا ۝۳ اَوْ زِدْ عَلَیْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِیْلًا ۝۴﴾ ''(اے نبی ﷺ!) رات کو قیام کیا کریں' سوائے اس کے تھوڑے سے حصے کے۔ نصف رات' اس سے تھوڑا کم یا تھوڑا زیادہ اور ٹھہر ٹھہر کر قرآن پڑھیے''۔ اسی سورۃ کی آخری آیت میں' جو بعد میں نازل ہوئی' دو تہائی یا نصف یا ایک تہائی رات تک قیام کرنے کی پابندی ختم کر دی گئی اور یہ سہولت دے دی گئی کہ ہر شخص اپنی استطاعت کے مطابق قیام اللیل میں جتنا ممکن ہو اتنا قرآن پڑھ لیا کرے۔



حضور اکرم ﷺ کی زندگی اہل ایمان کے لیے بہترین نمونہ ہے۔ پس پوری رات یا رات کا بیشتر حصہ عبادت میں گزارنا اللہ کے حکم کے خلاف اور اُسوۂ حسنہ کے عملی نمونے سے تجاوز ہے۔ حضور اکرم ﷺ کا مشن تھا کہ وہ اللہ کے پسندیدہ کاموں کا حکم دیں اور لوگ اپنی طرف سے جو مشکل کام اختیار کریں ان سے انہیں روکیں۔ قرآن مجید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿یَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَیُحِلُّ لَهُمُ الطَّیِّبٰتِ وَیُحَرِّمُ عَلَیْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَیَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِیْ كَانَتْ عَلَیْهِمْ﴾ (الاعراف:۱۵۷) ''وہ (رسول اللہ ﷺ) انہیں نیک کام کرنے کا حکم دیتے ہیں اور برے کام سے روکتے ہیں اور پاک چیزوں کو ان پر حلال کرتے ہیں اور ناپاک چیزوں کو ان پر حرام ٹھہراتے ہیں اور ان پر سے وہ بوجھ اور طوق جو اُن پر تھے اتارتے ہیں''۔ یہ اِصر اور اَغلال وہ طریقے تھے جو لوگوں نے اپنی طرف سے اختیار کر رکھے تھے' حالانکہ اللہ نے ان کا حکم نہیں دیا تھا۔ بدعات اسی قبیل کی چیزیں ہیں۔ یہود و نصاریٰ نے رہبانیت اختیار کر لی کہ وہ دنیا سے کنارہ کش ہو کر تجرد کی زندگی گزاریں' اس طرح وہ گناہ سے بچے رہیں گے اور اللہ کی عبادت کرتے رہیں گے۔ چونکہ ترکِ دنیا اللہ کا حکم نہ تھا اس لیے وہ اس بدعت کو اختیار کر کے اللہ کو ناراض کر بیٹھے' اگرچہ وہ اپنے خیال میں اللہ کی رضا حاصل کرنا چاہتے تھے۔ مگر اللہ کی رضا تو صرف ان کاموں سے حاصل ہوتی ہے جن کا اللہ نے حکم دیا ہے یا اُس کے رسول ﷺ نے۔ آج بعض مسلمان بھی عبادات میں غلو کو اچھا جانتے ہیں اور یہ نہیں سوچتے کہ عبادت کا بہترین انداز اور طریقہ تو وہی ہے جس پر حضور ﷺ عمل پیرا تھے۔ آپؐ رات کی نماز میں اس قدر طویل قیام فرماتے کہ آپؐ کے پاؤں مبارک سوج جاتے' مگر اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو اس مشقت سے روک دیا' جیسا کہ سورۃ المزمل میں ہے۔

عبادات میں نماز کا درجہ سب سے اونچا ہے۔ قرآن میں جگہ جگہ نماز ادا کرنے کی تاکید ہے' مگر غلو کی اس میں بھی اجازت نہیں۔ دن رات میں صرف پانچ نمازیں فرض ہیں۔ اس کے علاوہ نفل پڑھنے کی ترغیب ہے' مگر نفل نمازوں کی مشغولیت میں حقوق العباد تلف کرنے کی اجازت نہیں۔ دنیاوی زندگی کے ضروری کام کرنے سے نہیں روکا گیا' بلکہ جائز ضروری کام کو باعثِ ثواب بتایا گیا ہے۔ روزے سال بھر میں ایک ماہ کے فرض ہیں۔ اس کے علاوہ نفل

روزے رکھنا کارِ ثواب ہے‘ لیکن نفل روزے بھی وہ پسندیدہ ہیں جو حقوق العباد اور دوسرے ضروری دنیاوی کاموں کی ادائیگی میں رکاوٹ نہ بنیں۔ بخاری اور مسلم کی روایت کردہ حدیث اس بارے میں صحیح طرزِ عمل کی نشاندہی کرتی ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

’’تین آدمی رسول اللہ ﷺ کی ازواجِ مطہرات کے گھروں کی طرف آئے‘ وہ نبی کریم ﷺ کی عبادت کے بارے میں سوال کرتے تھے‘ جب ان کو آپؐ کی عبادت کے بارے میں بتایا گیا تو انہوں نے اس کو تھوڑا سمجھا اور دل میں خیال کیا کہ ہم نبی کریم ﷺ سے کیا مناسبت رکھتے ہیں‘ آپؐ کے اگلے اور پچھلے تمام گناہ معاف ہو چکے ہیں۔ ایک نے کہا کہ میں ہمیشہ رات بھر نماز پڑھتا رہوں گا۔ دوسرے نے کہا کہ میں ہمیشہ روزے رکھوں گا اور افطار نہیں کروں گا۔ تیسرے نے کہا میں عورتوں سے الگ تھلگ رہوں گا اور کبھی نکاح نہ کروں گا۔ چنانچہ (جب رسول اللہ ﷺ کے علم میں یہ بات آئی تو) آپ ﷺ ان کے پاس تشریف لائے اور فرمایا: تم ہی وہ لوگ ہو جنہوں نے ایسی ایسی باتیں کہی ہیں؟ خبردار! اللہ کی قسم‘ میں تم سب سے زیادہ اللہ سے ڈرتا ہوں اور تقویٰ اختیار کرتا ہوں‘ لیکن میں (نفل) روزہ بھی رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں اور (نفل) نماز بھی پڑھتا ہوں اور سو بھی جاتا ہوں اور عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں۔ پس جو شخص میری سنت سے اعراض کرے وہ میری امت سے نہیں ہے۔‘‘ (متفق علیہ)

اس مضمون کو مزید احادیث میں بھی واضح کیا گیا ہے اور عبادت میں غلو اور مشقت سے روکا گیا ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ تشریف لائے تو وہاں دو ستونوں کے درمیان ایک رسی بندھی ہوئی تھی۔ آپؐ نے پوچھا: ’’یہ رسی کیسی ہے؟‘‘ صحابہؓ نے عرض کیا: یہ رسی حضرت زینبؓ نے باندھ رکھی ہے‘ جب وہ عبادت کرتے کرتے تھک جاتی ہیں تو رسی کے ساتھ چمٹ جاتی ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: اسے کھول دو‘ تم نشاط کے وقت نماز پڑھو‘ جب تھکاوٹ ہو جائے تو آرام کرو۔ (متفق علیہ)

اپنے آپ کو مشقت میں ڈال کر عبادت کرنا اور اس عبادت کو حصولِ ثواب کا ذریعہ سمجھنا نادانی ہے‘ کیونکہ یہ سنت کے خلاف ہے‘ اور جو کام سنت کے خلاف ہو وہ ثواب کا باعث کیسے ہو سکتا ہے؟



خلافِ پیمبر کسے راہ گزید  کہ ہرگز بمنزل نخواہد رسید!

حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: ’’میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نمازیں پڑھا کرتا تھا‘ چنانچہ آپؐ کی نماز اور آپؐ کا خطبہ درمیانہ ہوتا۔‘‘ (مسلم)

عبادات میں شدت اور سختی نہ صرف منع ہے بلکہ ہلاکت اور بربادی کا سبب ہے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ’’شدت اور سختی کرنے والے ہلاک اور برباد ہو گئے‘‘۔ آپؐ نے یہ الفاظ تین مرتبہ دہرائے۔ (مسلم) ویسے تو ہر کام میں میانہ روی ہی پسندیدہ اور نتائج کے اعتبار سے اچھی ہے‘ مگر عبادت چونکہ اللہ تعالیٰ کو خوش کرتی ہے لہٰذا غلطی سے انسان اس میں غلو کو اچھا جانتا ہے۔ ایسا کرنا تو ممنوعات میں شامل ہے اور سنت کی خلاف ورزی ہے۔ حضرت وہب بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

’’نبی کریم ﷺ نے سلمان اور ابوالدرداء (رضی اللہ عنہما) کو ایک دوسرے کا بھائی بنایا‘ چنانچہ سلمانؓ ابوالدرداءؓ سے ملنے کے لیے گئے تو دیکھا کہ اُمّ الدرداءؓ نے بوسیدہ سا لباس پہن رکھا ہے۔ سلمان نے پوچھا کیا بات ہے؟ انہوں نے جواب دیا: تمہارے بھائی ابوالدرداء کو دنیا سے کچھ حاجت نہیں ہے۔ پس ابوالدرداء آئے تو انہوں نے سلمان کے لیے کھانا تیار کیا اور کہا آپ کھا لیجیے میں روزے سے ہوں۔ سلمان نے کہا جب تک آپ نہیں کھائیں گے میں نہیں کھاؤں گا۔ چنانچہ انہوں نے بھی کھانا کھا لیا۔ جب رات ہوئی تو ابوالدرداء قیام کے لیے کھڑے ہو گئے۔ سلمان نے ان سے کہا سو جاؤ۔ وہ سو گئے (کچھ دیر ٹھہر کر) پھر قیام کے لیے کھڑے ہو گئے۔ سلمان نے کہا سو جاؤ (وہ سو گئے) جب رات کا آخری حصہ ہوا تو سلمان نے کہا: اب اٹھو۔ دونوں نے نماز پڑھی۔ سلمان نے ان سے کہا: بے شک تمہارے پروردگار کا تم پر حق ہے‘ تمہارے نفس کا بھی تم پر حق ہے‘ تمہارے گھر والوں کا بھی تم پر حق ہے‘ پس ہر حق والے کو اس کا حق دو! پھر وہ نبی کریم ﷺ کے پاس آئے اور اس کا آپؐ سے ذکر کیا۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ’’سلمان نے سچ کہا۔‘‘

قرآن مجید کی تلاوت بہت بڑی نیکی ہے۔ نبی اکرم ﷺ کے فرمان کے مطابق ایک حرف پر دس نیکیاں ملتی ہیں- الٓمٓ ایک نہیں تین حروف ہیں۔ گویا تلاوتِ قرآن نیکیاں کمانے کا بہت اونچا عمل ہے۔ مگر نماز‘ روزے اور دوسری عبادات کی طرح یہاں بھی میانہ روی ہی

پسندیدہ ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما راوی ہیں کہ آپؐ نے مجھ سے فرمایا:

''کیا مجھ کو اس بات کی اطلاع نہیں ملی کہ تم ہمیشہ روزہ رکھتے ہو اور ہر رات میں قرآن ختم کرتے ہو؟'' میں نے کہا جی ہاں یارسول اللہ! اور میں اس سے بھلائی کا ہی ارادہ رکھتا ہوں۔ آپؐ نے فرمایا: ''تم اللہ کے نبی داؤد علیہ السلام جیسا روزہ رکھو۔ کیونکہ وہ سب سے زیادہ عبادت گزار تھے اور ایک مہینہ میں ایک قرآن ختم کرو''۔ میں نے عرض کیا کہ اے اللہ کے نبیؐ میں اس سے زیادہ کی طاقت رکھتا ہوں۔ آپؐ نے فرمایا: ''تو بیس دن میں ختم کرو''۔ میں نے کہا: اے اللہ کے نبیؐ! میں اس سے زیادہ کی قوت رکھتا ہوں۔ تو آپؐ نے فرمایا: ''دس روز میں ختم کرو''۔ میں نے عرض کیا یا نبی اللہ! میں اس سے بھی زیادہ کی طاقت رکھتا ہوں۔ تو آپؐ نے فرمایا: ''ایک ہفتہ میں قرآن پڑھو اور اس پر زیادتی نہ کرو''.....الخ (صحیحین)

حج زندگی میں ایک بار فرض ہے' وہ بھی اُس پر جس کو استطاعت ہو' ورنہ نہیں۔ جس نے ایک دفعہ حج کر لیا وہ کافی ہے۔ ہاں اگر وہ اس کے بعد نفل حج کرنا چاہے یا عمرہ کرے تو اچھا ہے' فرض تو ادا ہو چکا۔ اسی طرح زکوٰۃ صاحب مال پر پورے سال کے بعد اڑھائی فیصد فرض ہے۔ یہ شرح زائد از ضروریات مال رکھنے والے کے لیے معمولی رقم ہے۔ ہاں وہ اس کے علاوہ صدقہ و خیرات کرے تو عند اللہ ماجور ہوگا۔ یہاں بھی اپنی اور اپنے اہل و عیال کی ضروریات سے بچ جانے والے مال پر انفاق فی سبیل اللہ کا اطلاق ہوتا ہے۔ ﴿يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۭ قُلِ الْعَفْوَ ۭ﴾ (البقرۃ:۲۱۹) ''(اے نبیؐ!) آپ سے پوچھتے ہیں کیا خرچ کریں؟ کہہ دیجیے جو ضرورت سے زائد ہو''۔ اس بات کو ناپسند کیا گیا ہے کہ کوئی صاحبِ مال اپنے اور اپنے بال بچوں پر کنجوسی سے خرچ کرے۔ نہ اچھا کھائے نہ پہنے اور صاحبِ مال ہونے کے باوجود اپنے اور اپنے اہل و عیال پر غربت طاری رکھے' کیونکہ اپنے اور اپنے بیوی بچوں کے جائز اخراجات پورے کرنا بھی ضروری ہے' بلکہ ثواب کا باعث ہے۔

المختصر جس طرح رسول اللہ ﷺ کا اُسوہ ہر عمل میں اعلیٰ معیار کا ہے' اسی طرح عبادات کا انداز اور طریقہ بھی وہی صحیح ہے جس کی آپؐ نے ہدایت دی ہے۔ اور جو کوئی اس کے خلاف میں بہتری سمجھے وہ اسلام کے عمومی مزاج سے بے خبر ہے۔

❁❁❁

# اسلام کا معاشی نظام

## بسلسلہ ''نظامِ خلافت: کیا؟ کیوں؟ کیسے؟'' (۸)

شجاع الدین شیخ☆

''نظامِ خلافت'' کے بیان کے تسلسل میں آج ''اسلام کے معاشی نظام'' پر گفتگو کرنی ہے۔اس ضمن میں ایک بہت اہم اور بنیادی بات واضح کردینے کی ضرورت ہے کہ اسلام محض ایک نظامِ معیشت نہیں' بلکہ ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے جو افراد' معاشرے اور نظامِ ریاست کے لیے مکمل رہنمائی فراہم کرتا ہے۔ چنانچہ اسلام نے معاشی زندگی کے لیے بھی بنیادی ہدایات عطا فرمائی ہیں۔

عموماً دو ہی قسم کے معاشی نظاموں کے حوالے سے گفتگو ہوتی رہی ہے اور دورِ حاضر میں تو ایک ہی نظام باقی بچا ہے جس کو ہم ''سرمایہ دارانہ نظام'' کہتے ہیں۔اس سے قبل ''اشتراکیت'' کا غلغلہ تھا۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ انسان جب الہامی ہدایت سے دور ہوتا ہے' تو وہ کبھی نقطہ اعتدال پر نہیں رہ سکتا اور عدم توازن کا شکار ہوجاتا ہے۔ چنانچہ معیشت کے تناظر میں بھی اگر ایک انتہا سرمایہ دارانہ نظام ہے تو اسی کے ردعمل میں ایک دوسری انتہا اشتراکیت ہے۔ ذیل میں ان دونوں نظاموں کے فرق کو انتہائی اختصار کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے۔ پھر ہم اسلام نے عدل پر مبنی معاشی نظام کے بارے میں جو تعلیمات دی ہیں' ان پر نظر ڈالیں گے۔

### اشتراکیت (سوشلزم) کا جائزہ

سب سے پہلے اشتراکیت کا ایک مختصر سا جائزہ آپ کے سامنے رکھتے ہیں' جو درحقیقت سرمایہ دارانہ نظام کے تباہ کن نتائج کے خلاف شدید ترین ردعمل تھا۔ سرمایہ دارانہ نظام میں فرد کو مکمل آزادی دے دی جاتی ہے جو اجتماعیت کے لیے نقصان کا باعث بنتی ہے۔اس ردعمل کا نتیجہ یہ نکلا کہ اشتراکیت نے فرد کی ذاتی ملکیت پر بھی پابندی لگادی اور مارکیٹ کا جو ایک مسابقتی عمل ہوتا ہے' جہاں لوگ محنت کرکے زیادہ کمانے کی کوشش کرسکتے ہیں' اس کو بھی ختم کرڈالا۔ یہ ایک طرح سے جبری مساوات کا مسلط کیا جانا تھا۔ایک شخص کسی فن کا خواہ کتنا ہی جاننے والا' استعداد رکھنے والا ہو' وہ

☆امیر تنظیم اسلامی حلقہ کراچی شمالی



جتنی چاہے محنت کرلے' لیکن اس کو معاوضہ اتنا ہی ملے گا جتنا کہ دوسرے کم استعداد والے کو دیا جائے گا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ لوگوں کے لیے زیادہ محنت کرنے میں رغبت باقی نہ رہی۔ ظاہر بات ہے کہ جب ان کے لیے معاوضے میں کوئی ترغیب وتشویق ہی نہیں رہی تو پھر وہ بھلا کیوں بڑھ چڑھ کر محنت کریں؟ گویا ایک غیر فطری اور خیالی معیشت کو فطری عمل کی بجائے انسانی سوچ کے تحت قائم کرنے کی کوشش کی گئی۔اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انسانوں کی اکثریت کی قسمت چند افراد یعنی حکمرانوں کے ہاتھوں میں آگئی۔ سرمایہ داری میں کلی اختیار جن افراد کے پاس ہوتا ہے' وہ سرمایہ دار بنتے چلے جاتے ہیں اور بقیہ لوگوں پر حاوی ہوجاتے ہیں' جبکہ اشتراکیت میں ریاستی سطح پر اس کی شکل میں ایک بہت بڑا سرمایہ دار وجود میں آگیا۔ وہ جو چھوٹے چھوٹے دائروں (pockets) میں مکمل آزادی کے نتیجے میں اجتماعیت کا کم نقصان ہوتا تھا' اب پوری ریاست نے جبراً ایک بڑے سرمایہ دار کی حیثیت اختیار کرلی اور افراد کو جبراً دبانے کی کوشش کی گئی۔ چونکہ یہ ایک غیر فطری نظام تھا' لہٰذا زیادہ دیر چل نہ سکا اور موت کے گھاٹ اُتر گیا۔اس کے نتیجے میں ماضی کا سرمایہ دارانہ نظام اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ چھا گیا۔

### سرمایہ دارانہ نظام (کیپٹلزم) کا جائزہ

سرمایہ دارانہ نظام میں بنیاد یہ ہوتی ہے کہ افراد کی ذاتی ملکیت کو تسلیم کیا جاتا ہے' ان کو عمل کی آزادی بھی دی جاتی ہے اور معاشرے میں مسابقت کا موقع بھی دیا جاتا ہے۔ چونکہ یہ نظام الہامی تعلیم کے تحت وجود میں نہیں آیا بلکہ انسانی غور وفکر کا نتیجہ ہے' لہٰذا اس میں بھی بہت سی قباحتیں سامنے آئیں۔اگرچہ صحیح اور غلط کا ایک تصور انسانی سوچ میں بھی ہے' لیکن اس کا اصل معیار الہامی تعلیمات کی روشنی میں ہی معین کیا جاسکتا ہے۔ اس نظام کو انسان نے اپنی سوچ وفکر کے مطابق پروان چڑھایا' اس لیے یہاں جائز وناجائز یا حلال وحرام کا قطعاً کوئی فرق نہیں رکھا جاتا اور اس کے نتیجے میں تقسیم دولت کا عادلانہ نظام متاثر ہوتا ہے۔ یوں بھی جب انسانی عقل کو معیار بنا کر نظام بنانے کی کوشش کی جائے گی تو لازماً گروہی تعصب' ذاتی منفعت' نچلے طبقے کی محرومی اور ظالمانہ قانون کا نظم سامنے آئے گا۔ کیپٹلزم کے نتیجے میں دولت کی گردش اور تقسیم کا نظام متاثر ہوتا ہے۔اسی کیپٹلزم کا ایک بنیادی ستون سود پر مبنی معیشت ہے' جس کے نتیجے میں ایک عام آدمی کو معاشی فوائد میں شامل ہونے کا موقع نہیں ملتا۔ بینکاری میں ایک محاورہ مشہور ہے کہ بینک خوشگوار موسم میں چھتری فراہم کرتا ہے اور بارش کے وقت واپس لے لیتا ہے۔ یعنی جب ضرورت مند مجبور ہوجائے تو بینک مدد نہیں کرتا بلکہ سرمایہ دار کو مزید قرض دینے کو تیار ہوجاتا ہے۔اس کے باعث عام آدمی غریب سے غریب تر ہوتا چلا جاتا ہے اور بڑے لوگوں کی چونکہ ساکھ (credibility) اور معاشرے میں

اپنی ایک حیثیت ہوتی ہے‘ تو اس کی بنا پر اس سودی نظام کے ذریعے وہ بھاری بھرکم قرضے لے لیتے ہیں۔ عام افراد چاہے کتنے ہی استعداد رکھنے والے ہوں‘ ان کو یہ سودی نظام‘ معیشت کے ذریعے ملنے والے فوائد میں پورے طور پر شامل ہونے کا موقع نہیں دیتا۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ چاہے سودی بینکاری کا معاملہ ہو یا جوئے اور سٹے کے ذریعے اسٹاک مارکیٹ کی فطری سرگرمیوں کو متاثر کیا جائے‘ دولت بہرحال چند ہاتھوں میں محدود ہو جاتی ہے اور ان کی منصوبہ بندی کے مطابق ہی یہ گردش کرتی ہے‘ جیسے کہ ماضی کے اعداد و شمار کے مطابق دنیا کے ۷۰ فیصد وسائل پر ۲۲۵ افراد قابض ہیں یا یوں کہیے کہ دنیا میں ۷۰ فیصد مالی معاملات کے فیصلے یہی ۲۲۵ افراد کر رہے ہوتے ہیں۔ الغرض سرمایہ دارانہ نظام کا نتیجہ یہ نکلا کہ امیر‘ امیر سے امیر تر اور غریب‘ غریب سے غریب تر ہوتا گیا۔

## اسلامی نظامِ معیشت

اب بات کرتے ہیں اسلامی نظامِ معیشت کی۔ سب سے پہلے یہ تو بنیادی بات یاد رکھی جائے کہ اسلام صرف معیشت کا ایک نظام ہی نہیں بلکہ دینِ فطرت اور الہامی تعلیمات پر مبنی ایک جامع نظامِ حیات ہے۔ ذیل میں ہم اسلامی نظامِ معیشت اور باقی نظاموں کے فرق کا جائزہ لیتے ہیں—— دُنیوی طور پر ایک تجزیہ ہمارے سامنے یہ آتا ہے کہ اشتراکیت اور سرمایہ داری میں اصل بنیاد مادہ پرستی ہے‘ جبکہ اسلام زندگی کے تمام گوشوں کے لیے جو تعلیمات اور ہدایات عطا کرتا ہے‘ اس کے لیے اصل بنیاد ایمان اور روحانیت کی ترقی ہے۔ اسی طرح سوشلزم اور کیپٹلزم میں زیادہ توجہ دُنیوی زندگی‘ اسی کی شان و شوکت اور ترقی پر ہوتی ہے‘ جبکہ اس کے برعکس اسلام بنیادی زور اُخروی زندگی اور اس کی کامیابی پر دیتا ہے کہ افراد کی اصل زندگی آخرت کی زندگی ہی ہے۔ اگر بات کی جائے مندرجہ بالا معاشی نظاموں کے بنیادی نکات کی تو سوشلزم میں انسانی ہی مساوات کا نعرہ ہے جو جبراً مسلط کی جاتی ہے اور کیپٹلزم میں فرد کی آزادی کا مکمل تصور دکھائی دیتا ہے جس میں الہامی تعلیم کو ایک طرف رکھ دیا جاتا ہے اور افراد کی آزادی‘ اجتماعیت کے مفاد کو اکثر نقصان پہنچاتی ہے۔ اسلام جو بنیادی اصطلاح (catchword) دیتا ہے وہ ’’عدل‘‘ ہے تاکہ افرادِ انسانی کو جینے کا موقع بھی ملے اور وہ جو محنت جائز حدود کے اندر رہتے ہوئے کر سکتے ہیں‘ اس کا پورا عوض اور ثمر بھی وہ حاصل کر سکیں۔

اس تجزیے میں آخری بات یہ ہے کہ اختیار کسے حاصل ہے؟ جب ہم اشتراکی نظام کی بات کرتے ہیں تو وہاں ریاست ہی کُل اختیار رکھتی ہے جبکہ سرمایہ دارانہ نظام میں جس کا سرمایہ ہے وہ اصل اہمیت رکھتا ہے۔ جس کے پاس سرمایہ زیادہ ہے اس کے لیے مواقع بھی زیادہ



ہیں۔ چاہے کتنے ہی باصلاحیت افراد معاشرے میں موجود ہوں‘ اگر ان کے پاس سرمایہ نہیں ہے تو وہ محروم رہ جائیں گے۔ جبکہ اسلامی تعلیمات کے مطابق اختیار نہ افراد کے پاس ہے اور نہ ریاست کے پاس بلکہ اصل اختیار اللہ ربّ العزت کو حاصل ہے۔ قرآن مجید میں تین مقامات پر یہ اصولِ محکم بیان ہوا ہے کہ حاکمیت کا اختیار صرف اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا ہے۔

اس اعتبار سے اسلام کے نظریۂ معیشت کی دو بنیادی باتیں جان لیجیے۔ سب سے پہلی بات یہ ہے کہ ذاتی ملکیت کا حق دین اسلام نے عطا کیا ہے‘ لیکن نہ یہ مطلق ہے اور نہ غیر مشروط ہے۔ افراد کو ملکیت کا حق حاصل ہے۔ وہ جائیدادیں بنا سکتے ہیں‘ اپنی ملکیت میں اشیاء کو لا سکتے ہیں‘ لیکن اس پر کچھ شرائط عائد ہوں گی اور کچھ پابندیاں بھی لگائی جائیں گی۔ مثلاً ان کو زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی‘ حلال و حرام میں تمیز کرنا ہوگی اور یہ پابندی کمانے اور خرچ کرنے دونوں پر عائد ہوگی۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ اسلام نے یقیناً آزادی کی بات کی ہے اور مساوات کا تصور بھی دیا ہے‘ مگر اس پر بھی کچھ پابندیاں عائد کی ہیں۔ بقولِ اقبال ؎

صنوبر باغ میں آزاد بھی ہے‘ پا بہ گِل بھی ہے
انہی پابندیوں میں حاصل آزادی کو تُو کر لے!

یعنی مساوات کا معاملہ جبری نہیں ہو سکتا۔ اسلام میں ایسی مساوات نہیں ہے کہ افراد کی جائز آزادی پر بھی پابندی لگ جائے۔ البتہ امیر اور غریب کے درمیان فرق کو کم سے کم کرنے کی کوشش کی جائے گی تاکہ وہ افراد جو معیشت کی دوڑ میں پیچھے رہ گئے ہیں‘ ان کو بھی جینے کا حق میسر آ سکے۔ گویا جس طرح ذاتی ملکیت غیر مشروط یا مطلق نہیں ہے بعینہٖ یہی معاملہ مساوات کا بھی ہے۔ ایسا تو ممکن نہیں کہ سارے افراد امیر ہو جائیں یا سارے کے سارے غریب ہو جائیں۔ یہ ایک غیر فطری بات ہے۔ لوگوں کے درمیان مالی لحاظ سے فرق ہونا فطری بات ہے‘ البتہ معاشرے میں زیادہ کمانے والوں پر یہ ذمہ داری لگائی گئی ہے کہ دولت کی اس گردش کو غریبوں کی طرف بھی لے جائیں۔ سورۃ الحشر کی آیت ۷‘ جو اسلامی تعلیمات کا معیشت کے بارے میں پالیسی بیان ہے‘ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةً بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ﴾ ’’تاکہ دولت تمہارے اہلِ ثروت ہی کے درمیان گردش میں نہ رہ جائے‘‘۔ دولت کی تقسیم کا یہ تصور جو اسلام نے عطا کیا ہے‘ اس کو ایک اور انداز سے رسول اللہ ﷺ نے یوں بیان فرمایا ہے کہ ’’یقیناً اللہ نے ان (مسلمانوں) کے امیروں کی دولت پر (زکوٰۃ و) صدقات کو لازم کیا ہے‘ جو ان

سے لے کر ان کے غریبوں پر خرچ کیے جائیں گے۔'' (سنن الترمذی)

یہی وہ بات ہے جو جدید معیشت ہمیں اس انداز سے سمجھاتی ہے کہ *better the circulation better the economy* یعنی جتنی زیادہ دولت گردش کرے گی اتنی ہی زیادہ معیشت میں بہتری ہوتی چلی جائے گی۔ اسلام میں کچھ باتوں کی ممانعت ہے جن کا ذکر بعد میں کیا جائے گا۔ کچھ آمدن (*revenue generation*) کے لیے بھی ہدایات ہیں جن کا ذکر آگے ہوگا۔ ان سب کا بنیادی مقصد ایک ایسی معیشت پروان چڑھانا ہے جہاں ہر ایک کو جینے کا حق ملے اور ایسا نہ ہو کہ امیر امیر تر اور غریب غریب تر ہوتا چلا جائے اور معاشرہ عدم توازن کا شکار ہو جائے۔ اسی طرح اسلام نے تقسیمِ دولت کے لیے نظامِ وراثت بھی دیا ہے جس میں دولت مسلسل ورثاء کے ذریعہ تقسیم ہوتی ہے تاکہ باقی ورثاء بھی (محنت کرتے ہوئے) معاشرہ کی بہبود کے عمل میں شریک ہو سکیں۔

## اسلامی معیشت کے بنیادی خدوخال

اب چند وہ بنیادی ہدایات جو معیشت کے حوالے سے اسلامی تعلیمات میں ہمیں عطا کی گئی ہیں، ان کا تذکرہ پیش خدمت ہے۔ اسلامی نظامِ معیشت اور انسانی نظام ہائے معیشت میں بنیادی فرق یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مالک اور ہم امین ہیں۔ قرآن بار بار کہتا ہے کہ ﴿لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ﴾ ''اللہ ہی کے لیے زمین و آسمان کی بادشاہت ہے''۔ اس بنیادی فرق کو سمجھ لینا ضروری ہے۔ جب مالک اللہ ہے تو مرضی اُسی کی چلے گی اور جب ہماری حیثیت امین کی ہے تو پھر ہم من مانی کیسے کر سکتے ہیں؟ ہمیں بس اتنا اختیار ہے کہ مالک کے عطا کردہ دائرۂ کار کے اندر رہتے ہوئے معاش کا معاملہ چلا سکیں۔ دوسرا بنیادی تصور جو دین اسلام ہمیں عطا کرتا ہے وہ ''عدل'' کا ہے۔ قرآن حکیم تمام انبیاء و رسل علیہم السلام کی بعثت کا مقصد ''قیامِ عدل'' قرار دیتا ہے۔ سورۃ الحدید میں فرمایا گیا: ﴿لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ﴾ (آیت ۲۵) ''ہم نے بھیجا اپنے رسولوں کو واضح نشانیوں کے ساتھ اور ہم نے ان کے ساتھ کتاب اور میزان اُتاری تاکہ لوگ انصاف پر قائم ہوں''۔ اسی طرح سورۃ الشوریٰ میں رسول اللہ ﷺ سے کہلوایا گیا: ﴿وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ ؕ﴾ (آیت ۱۵) ''اور مجھے حکم ہوا ہے کہ میں تمہارے مابین عدل قائم کروں''۔ آج ہم ایک انتہا پر سوشلزم کو دیکھتے ہیں تو دوسری انتہا پر کیپٹلزم کو اور انسانیت ان دونوں کے درمیان پنڈولم کی طرح چکر لگا رہی



ہے۔ ''العادل'' اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ میں سے ایک نام ہے جس کے معنی ہیں: بہت عدل کرنے والی ذات۔ جب تک ہم اس عادل ذات کے بنائے ہوئے قوانین کو نافذ نہیں کرتے، اُس کی عطا کردہ ہدایت کے تحت معاملات نہیں چلاتے، لوگوں کو حقیقی عدل میسر نہیں آ سکتا۔

ایک اور بنیادی تصور جو ہمارا دین ہمیں عطا کرتا ہے، وہ حکومتی کردار اور پابندیوں کا ہے۔ افراد کو مادر پدر آزادی نہیں ہے کہ جس طرح چاہے کمائیں۔ وقت کی حکومتیں جو اختیار رکھنے والی (authorities) ہوتی ہیں، ان کا بھی کردار اہم ہے کہ ایسے تمام امور جو شریعت نے حرام قرار دیے ہیں، ان سے لوگوں کو روکا جائے۔ ایسے معاملات جن سے لوگوں کو جینے کا حق نہ ملتا ہو، لوگوں کو ان کے جائز حقوق میسر نہ آتے ہوں، ان پر بھی حکومتِ وقت پابندیاں لگائے گی۔ مثلاً معاشرے میں قیمتوں کو ایک مناسب درجہ پر رکھنے کا معاملہ۔ ایسا نہیں ہے کہ کوئی جتنا چاہے منافع کما لے اور ایسا ماحول پیدا ہو جائے کہ لوگوں کو اپنا جائز حق حاصل کرنا مشکل ہو جائے۔ ان مواقع پر کہ جہاں افراد کا نقصان ہو رہا ہو، وہاں حکومت کا کردار بہت اہم ہوگا۔ اس حوالے سے فقہاء نے ایک حدیث کے ذریعے سے یہ اصول اخذ کیا ہے کہ ((لَا ضَرَرَ وَلَا ضِرَارَ)) ''نہ نقصان اٹھاؤ اور نہ نقصان پہنچاؤ'' (صحیح بخاری)

اسلام کے نظامِ معیشت سے متعلق ایک اور اہم پہلو اخلاقی تعلیمات کا ہے کہ اسلام صرف قانونی ہدایات ہی عطا نہیں کرتا بلکہ اخلاقی پہلو پر بھی زور دیتا ہے۔ اس کو ایک چھوٹی سی مثال سے یوں سمجھئے کہ ایسا نہیں ہے کہ معاشرے کے افراد جس طرح چاہے کمائیں، خواتین کو نیم عریاں لباس میں پیش کر کے اپنی مصنوعات کی مارکیٹنگ کریں اور لوگوں کے اخلاق کا جنازہ نکالیں۔ اس طرح لوگوں کی ایمانی کیفیات خطرے میں پڑ جائیں اور ان کی روحانی ترقی میں رکاوٹ پیدا ہونے لگے، اس کی قطعاً اجازت نہیں ہے۔

## اسلامی معیشت کے دو گوشے: اخلاقی اور قانونی

اس کے بعد ایک بہت ہی خوبصورت تجزیہ آپ کے سامنے رکھنا چاہوں گا۔ ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ اپنے کتابچے ''اسلام کا معاشی نظام'' میں بیان کرتے ہیں کہ اسلامی نظامِ معیشت کے دو گوشے ہیں۔ ایک اس کا اخلاقی اور روحانی گوشہ ہے اور دوسرا قانونی گوشہ ہے۔ یہ دونوں گوشے ملتے ہیں تو اسلامی نظامِ معیشت مکمل ہوتا ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کسی شے کا ایک ظاہری پہلو ہوتا ہے اور دوسرا اس کا باطنی پہلو۔ زکوٰۃ ہی کی مثال لے لیجئے۔ یہ اسلام کا کم سے کم تقاضا

ہے کہ زکوٰۃ ادا کی جائے۔حضرت ابوبکر صدیق ؓ نے مانعینِ زکوٰۃ کے خلاف جہاد کیا تھا۔ زکوٰۃ دین کا کم سے کم تقاضا ہے اور یہ اللہ عزوجل کی راہ میں مال خرچ کرنے کا ایک طریقہ ہے' لیکن صرف یہ کافی نہیں ہے۔ چنانچہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:((اِنَّ فِی الْمَالِ لَحَقًّا سِوَی الزَّکَاۃِ)) (سنن الترمذی) ''بے شک مال میں زکوٰۃ کے علاوہ بھی حصہ ہے''۔ نیز اخلاقی طور پر یہ ذمہ داری افراد پر عائد ہوتی ہے کہ اپنی ضروریات پوری ہو جانے کے بعد جو مال بچ جائے وہ معیشت کی دوڑ میں پیچھے رہ جانے والوں کے حوالے کیا جائے۔قرآن کریم کبھی اس کی ترغیب یوں دلاتا ہے کہ:﴿وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰی حَقَّهٗ وَالْمِسْكِیْنَ وَابْنَ السَّبِیْلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِیْرًا ﴿۲۶﴾﴾ (بنی اسرائیل) ''اور حق ادا کرو قرابت داروں' مسکینوں اور مسافروں کا اور فضول میں مال مت اڑاؤ''۔ گویا تم دوسرے کا حق اور اپنا (اخلاقی) فرض ادا کر رہے ہو نہ کہ کسی پر احسان کر رہے ہو۔کبھی قرآن اس طرح ترغیب دیتا ہے:﴿وَیَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ ؕ قُلِ الْعَفْوَ ؕ﴾ (البقرۃ:۲۱۹) ''اور یہ آپؐ سے پوچھتے ہیں کہ (اللہ کی راہ میں) کتنا خرچ کریں؟ کہہ دیجیے: جو بھی تمہاری ضرورت سے زائد ہو''۔اور کبھی رغبت دلانے کا انداز یوں ہے:﴿وَیُؤْثِرُوْنَ عَلٰۤی اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ؕ وَمَنْ یُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۹﴾﴾ (الحشر) ''اور وہ تو خود پر ترجیح دیتے ہیں دوسروں کو خواہ ان کے اپنے اوپر تنگی ہو۔اور جو کوئی بھی بچا لیا گیا اپنے جی (نفس) کے لالچ سے تو وہی لوگ ہیں فلاح پانے والے۔''

## اسلامی معیشت میں ممنوعہ باتیں

اب کچھ اہم باتیں پیش خدمت ہیں جو معیشت کے حوالہ سے اسلامی تعلیمات میں ممنوع ہیں:

۱۔ پہلی بات سود ہے جس میں مبتلا ہونے کو اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے جنگ کے مترادف قرار دیا گیا ہے (البقرۃ:۲۷۸)۔سود' خواہ وہ سرمایہ کی صورت میں ہو' تجارتی معاملات کی صورت میں ہو یا قرض کی صورت میں' ہر اعتبار سے اسلام میں اس کی ممانعت کی گئی ہے۔

۲۔ بیمہ (انشورنس) بھی ممنوع ہے۔انشورنس کے نام پر آج کل جو دھندہ شروع ہو گیا ہے' وہ امداد باہمی کی بجائے کمائی کا ذریعہ بن چکا ہے' اس میں سودی عنصر بھی شامل ہوتا ہے اور دھوکہ دہی بھی۔

۳۔ چوری' ڈکیتی کے ذریعے مال کمانے کو بھی حرام قرار دیا گیا ہے۔



۴۔ تشہیری ذرائع میں بے حیائی کو شامل کر کے مال کمانے کی کوشش جس سے اخلاق کا جنازہ نکلتا ہے' اس کی گنجائش بھی نہیں ہے۔

۵۔ رشوت کا لین دین' دھوکہ دہی' جھوٹی قسمیں اور جھوٹ بول کر مال کمانا' اس کی بھی ممانعت ہے۔

۶۔ ناجائز یا حرام اشیاء کی تجارت' مثلاً شراب کی خرید و فروخت کی ممانعت ہے۔

۷۔ ناپ تول کی کمی' معیار اور تعداد میں گڑبڑ کی بھی گنجائش نہیں۔

۸۔ ذخیرہ اندوزی اور ملاوٹ کو منع کیا گیا ہے۔

۹۔ جوئے اور سٹہ کی ممانعت ہے۔ہمارے ہاں اسٹاک ایکسچینج کے اکثر معاملات انہی پر چلتے ہیں' جس سے معاشرے میں ایک مصنوعی قسم کی معیشت نظر آتی ہے' اس کی بھی گنجائش نہیں۔

۱۰۔ اسراف و تبذیر سے منع کیا گیا ہے' لیکن یہ باتیں اخراجات سے متعلق ہیں جن کی تفصیلات کا یہاں موقع نہیں۔

یہ چند ممنوعہ چیزیں ہیں جن کا نتیجہ عموماً معاشی عدم توازن' امیر و غریب کے مابین فرق میں اضافہ اور غیر منصفانہ تقسیم دولت کی صورت میں سامنے آتا ہے۔

## سرمایہ و محنت کا تعلق اور سرمایہ کاری کی ضرورتیں

ایک اور اہم معاملہ سرمایہ اور محنت کے تعلق کا ہے۔اسلام نے جو اصولی تعلیمات عطا کی ہیں ان کے مطابق بہترین طریقہ ترتیب وار یہ ہے کہ:

i) ایک شخص اپنی محنت اور مال دونوں لگائے اور حلال کاروبار کرے' اس میں نفع و نقصان دونوں کا احتمال ہے۔

ii) دوسری صورت نفع و نقصان کی بنیاد پر شراکت داری ہے۔کچھ افراد اپنا پیسہ و محنت لگائیں' کوئی صرف پیسہ لگائے جو سلیپنگ پارٹنر (غیر فعال حصہ دار) ہو۔

iii) ایک معاملہ مضاربت کا ہے' جہاں ایک شخص کی محنت اور دوسرے کا پیسہ ہوتا ہے۔اس کی تفصیلات میں جانے کا موقع نہیں ہے۔

چند اصولی پابندیوں کے ساتھ ان تمام صورتوں کی اجازت ہے' البتہ پیسے کے ذریعے پیسہ بنانے کی قطعاً ممانعت ہے' کیونکہ اس سے سودی معاملہ ہی عمل میں آتا ہے۔

اب آتے ہیں سرمایہ کاری کی ضرورتوں کی طرف۔اس ذیل میں طویل المدتی

(long term) اور قلیل المدتی (short term) دونوں طرح کی ضرورت کاروبار میں محسوس ہوتی ہے۔ کاروبار چاہے انفرادی سطح پر ہو یا ادارہ اور کمپنی کی سطح پر‘ سرمایہ کی ضرورت بہرحال ہوتی ہے۔ جہاں تک کارپوریٹ سیکٹر کی بات ہے وہاں سرمایہ کاری کی گنجائش ہے‘ سرمایہ داری کی نہیں۔ کاروبار نفع ونقصان کی بنیاد پر چلایا جائے گا‘ یہ اصولی مسئلہ ہے۔ نفع اور نقصان دونوں میں شراکت کا معاملہ ہوگا۔ اس ضمن میں بھی اوپر بیان کردہ کوئی بھی صورت استعمال ہوسکتی ہے۔ جہاں تک اشیائے صرف کی بات ہے تو افراد کی بنیادی اور روزمرہ کی ضروریات کی فراہمی ہونی چاہئے‘ لیکن آج جو ہم نے تعیّشات کو ضرورت بنالیا ہے‘ یہ درست نہیں ہے۔ اسلامی تعلیمات کے مطابق اس میں اصلاح کی ضرورت ہے۔ حکومت بھی اس معاملہ میں اصلاح کے لیے مفادِ عامہ کی خاطر تعیّشات پر پابندیاں لگاسکتی ہے یا دیگر اقدامات کرسکتی ہے۔ افراد کے لیے زندگی کی بنیادی ضروریات کی فراہمی اور دستیابی حکومتِ وقت کی ذمہ داری ہے۔ البتہ معاشرے کے افراد کی طلب کے مطابق اشیائے صرف دستیاب بھی کی جائیں‘ لیکن اس میں سودی معاملات میں پڑنے کی قطعاً گنجائش نہیں ہے۔ اسلامی تعلیمات کے مطابق بیرونی تجارت کی بھی اجازت ہوگی اور اگر کوئی نظام بینکاری ہوگا تو وہ کاروبار اور تجارت وغیرہ کے معاملات میں اپنی انتظامی ذمہ داری ادا کرسکتا ہے۔ تمام بینکوں کو تجارت کی اجازت ہوگی‘ لیکن بینک پیسوں کے نظم و نسق کے ذمہ دار ہوں نہ کہ سودی بنیادوں پر کمائی کرنے کی کوشش کریں۔

آج کے دور کا ایک اہم اور بہت بڑا مسئلہ کرنسی چھاپنا ہے جس کے پیچھے اصل زر نہیں ہوا کرتا‘ معاشرے میں ریزو بینکنگ کے نام سے ایک مصنوعی معیشت چلتی ہے جس کے نتیجے میں معیشت میں عدم توازن پیدا ہوتا ہے۔ پہلے اتنی ہی کرنسی چھاپی جاتی تھی جس کے پیچھے اصل زر سونے کی صورت میں موجود ہوتا تھا۔ اسی تصور کی طرف جانے کی ضرورت ہے تاکہ سونے/چاندی جیسی قیمتی دھات کو بنیاد بنا کر اس کے برابر کاغذی نوٹ مارکیٹ میں زیرگردش لائے جائیں۔

## اسلامی معیشت میں ذرائع آمدن

جہاں تک ذرائع آمدن کا معاملہ ہے‘ معیشت کے ذیل میں حکومت کے ذرائع آمدن میں زکوٰۃ بھی شامل ہے جو حدیث کے مطابق اُمراء سے لے کر غرباء میں تقسیم کی جائے گی اور اموالِ ظاہرہ پر زکوٰۃ کی وصولی کا حکومتی نظام ہوگا۔ عُشر کا معاملہ بھی زکوٰۃ کی طرح ہے‘ البتہ زکوٰۃ سال کے بعد اس مال پر وصول کی جاتی ہے جو نصاب تک پہنچتا ہو‘ لیکن عُشر فصل کے آنے پر وصول کیا جاتا



ہے۔ پاکستان کے تناظر میں تو یہ بہت بڑا ذریعہ آمدن ہے جس کی طرف قطعاً توجہ نہیں دی جارہی۔ قرآن وسنت میں کچھ جرائم کے کفارے مقرر ہیں‘ جن میں مال پیش کرنا ہوتا ہے۔ اسی طرح صدقات اور انفاق کی وصولی بھی حکومتی سطح پر ہوسکتی ہے۔ اگر واقعتاً ایک اسلامی حکومت موجود ہو تو بیت المال بھی ہوگا جہاں انفاق اور صدقات جمع ہوں گے اور عوام کی بہبود پر خرچ کیے جائیں گے۔

اسلام میں خراج اور جزیے کا تصور بھی ہے جن کا شمار ذرائع آمدن میں ہوتا ہے۔ غیرمسلم جزیہ دیں گے اور اس کے عوض اسلامی حکومت ان کی جان ومال اور عزت وآبرو کی حفاظت کرے گی۔ خراج ان زمینوں پر ہوگا جو حکومت کی تحویل میں ہوں‘ افراد اس پر کام کریں گے اور حکومت کو خراج ادا کریں گے۔ یہ رقم بیت المال میں جمع ہوگی اور عوام کی بہبود پر استعمال کی جائے گی۔ حکومتی ذرائع آمدن میں مالِ غنیمت جسے قرآن نے ’انفال‘ کہا ہے اور ’مالِ فے‘ جو قرآن کی ایک اصطلاح ہے‘ بھی شامل ہیں۔ مالِ غنیمت وہ ہے جو جنگ کی صورت میں حاصل ہوتا ہے اور مالِ فے وہ ہے جو بغیر جنگ کیے حاصل ہوتا ہے۔ یہ سب بیت المال میں جمع ہوگا۔ اگر واقعتاً ان احکامات پر عمل کیا جائے تو بہت بڑے پیمانے پر ریاست کو آمدن کے ذرائع میسر آسکتے ہیں۔ اگر ریاست محسوس کرے تو ان کے علاوہ اضافی ٹیکس بھی لگاسکتی ہے۔ سیدنا عمر فاروق اور سیدنا علی رضی اللہ عنہما کے دورِ خلافت سے ہمیں کچھ دلائل میسر آسکتے ہیں۔ بجلی‘ گیس وغیرہ کی سہولیات کے عوض حکومت معاوضہ وصول کرسکتی ہے۔

افراد کی سطح پر وراثت کا تصور دیا گیا ہے کہ ایک کے مرنے پر اس کا مال دوسرے کو وراثت کے احکامات کے مطابق منتقل ہو۔ نیز افراد کو زیرکفالت لوگوں پر خرچ کرنے‘ رحمی رشتوں کا حق ادا کرنے اور معاشرہ کے نادار لوگوں پر خرچ کرنے کی ترغیب دلائی گئی ہے۔ مزید برآں‘ حکومت چاہے تو کچھ بڑے کاروباری ادارے شروع کرسکتی ہے۔ آج ہم کارپوریٹ سیکٹر اور اسٹاک ایکسچینج میں دیکھتے ہیں کہ کسی کمپنی کا بہت بڑا اسیٹ اپ ہوتا ہے اور ہزاروں شیئرز کے ذریعے پیسے جمع ہوتے ہیں۔ حکومت کے پاس وسائل زیادہ ہوتے ہیں اور وہ خود بھی بڑے منصوبے چلاسکتی ہے‘ البتہ یہ سارا کچھ نفع اور نقصان کی بنیاد پر کیا جائے گا۔

پاکستان کے تناظر میں ایک اہم پہلو زراعت کا ہے۔ ہماری ستّر فیصد آبادی زراعت سے تعلق رکھتی ہے۔ عُشر کا معاملہ تو پہلے بیان ہوچکا‘ دوسرا معاملہ غیرحاضر زمینداری کا ہے۔ اس پر ہمارے علماء نے بہت بحث کی ہے۔ بڑے بڑے زمینداروں کی زمینیں استعمال میں نہیں‘ بلکہ بےکار پڑی ہیں‘ جبکہ ان کی قیمت بڑھتی چلی جارہی ہے۔ یوں سرمایہ داروں کی طرح جاگیرداروں کا ٹولہ بھی موجود ہے جو ظلم وجور کا باعث بن رہا ہے۔ ان بےآباد زمینوں کو آباد کرنا ضروری ہے تاکہ ان سے فصل کا حصول ہو اور عوام کی حاجات بھی پوری ہوں۔ اس کے تناظر میں امام ابوحنیفہ اور امام

مالک رحمہا اللہ علیہما کے فتاویٰ اور اہلِ علم کی آراء سے استفادہ کر کے یہ دیکھنے کی ضرورت ہے کہ یہ ملک جہاں ہم ستّر سال سے آباد ہیں یہاں اب جاگیردار پیدا ہو گئے۔ یہ زمینیں انگریز چھوڑ کر چلا گیا ورنہ اس سے پہلے مسلمانوں کے دورِ حکومت میں یہ ساری زمینیں بیت المال کے پاس تھیں‘ اس پس منظر میں یہ مسئلہ طے کرنے کی ضرورت ہے۔ یقیناً یہ بہت بنیادی اور انقلابی نوعیت کا فیصلہ ہوگا۔

## اسلامی معیشت میں اخراجات کا جائزہ

جہاں تک اخراجات کا تعلق ہے تو آج اس حوالے سے بڑی بڑی مدات ہیں جن میں صحت‘ دفاع کا شعبہ‘ سوشل سیکورٹی کا مسئلہ اور اس طرح کے بہت سے معاملات ہیں۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانے میں بیروزگاروں اور معذوروں کی کفالت کا بھی انتظام تھا۔ تعلیم بھی ایک شعبہ ہے جو بدقسمتی سے آج بہت بڑا کاروبار بن گیا ہے‘ حالانکہ یہ عوام کی بنیادی ضرورت ہے۔ خدماتِ عامہ پر بھی حکومت کے اخراجات ہوتے ہیں‘ اس میں انفرااسٹرکچر بھی شامل ہے۔

ہم نے سودی بنیادوں پر قرضے لے رکھے ہیں جن پر ہمیں سود دینا پڑتا ہے۔ اگر سودی نظام ختم کر دیا جائے تو قرضوں پر سود کی ادائیگی سے ہماری جان چھوٹ جائے گی۔ حالت یہ ہے کہ سودی قرضوں کی وجہ سے ہمارے ہاں ہر پیدا ہونے والا بچہ ایک لاکھ روپے سے اوپر کا مقروض ہے۔ یوں ریاستی وسائل عوام کی بہبود کے بجائے سود در سود ادائیگی پر خرچ ہو رہے ہیں۔ مزید برآں اسلامی حکومت ہوگی تو فضولیات پر پیسے خرچ نہیں ہوں گے۔ حکومت کے ملازمین ہوں یا وزراء وغیرہ‘ وہ غیر ترقیاتی مدات یا اپنے ذاتی پرتعیش اخراجات پر عوام کا پیسہ خرچ نہیں کریں گے‘ بلکہ وہ عوام کے خادمین کی حیثیت سے کام کر رہے ہوں گے۔ ہمارے پاس اسلاف کی مثالیں موجود ہیں کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ تو سرکاری وسائل سے چراغ کا تیل تک ذاتی گفتگو کے دوران خرچ کرنے کے روادار نہیں تھے‘ چہ جائیکہ آج کے حکمران عوام کے پیسوں سے اندرون و بیرون ملک ذاتی جائیدادیں بنا رہے ہیں۔

## بینک اور اسٹاک ایکسچینج

شعبہ بینکاری کے حوالے سے ایک بات جو پہلے بھی بیان ہو چکی ہے اور وہ دو اور دو چار کی طرح بالکل واضح ہے کہ بینک پیسوں کا نظم و نسق چلا سکتا ہے‘ لیکن پیسوں کی بنیاد پر پیسہ نہیں کما سکتا۔ وہ مقامی اور بین الاقوامی تجارت میں بھی اپنا حصہ ڈال سکتے ہیں۔ بینک کمپنیوں کی طرح بڑے پروجیکٹس لگائیں‘ جن میں تکنیکی اسٹاف رکھ کر وہ بڑے بڑے کاروبار چلا سکتے ہیں۔ نفع اور نقصان کی بنیاد پر وہ اپنا منافع بھی رکھیں اور کھاتہ داران کو بھی ان کا پورا نفع دیں۔



اہم ترین بات یہ ہے کہ سارے معاملات نفع و نقصان کی بنیاد پر چلائے جائیں۔ یہ کہنا کہ رسک (خطرہ) کا معاملہ بہت ہے‘ تو سوال یہ ہے کہ دنیا کے کس کام اور کاروبار میں نقصان کا خطرہ نہیں ہوتا‘ تاہم کاروبار پھر بھی چل رہا ہے‘ تو بینک نفع و نقصان کی بنیاد پر کیوں کر کام نہیں کر سکتے؟ مزید برآں آج کل جو انٹر بینک معاملات ہوتے ہیں اس کے لیے ایک سودی بنیاد انٹر بینک ریٹ کی بجائے اشیاء کی بنیاد (commodity basis) پر ہو۔ مرکزی بینک بھی سرمایہ (equity) کی بنیاد پر معاملات کو لے کر چل سکتا ہے۔ مرکزی بینک بھی اگر سرمایہ کاری کے معاملات کو لے کر چلنا چاہے تو وہ بھی نفع و نقصان کی بنیاد پر ہوگا۔

جہاں تک اسٹاک مارکیٹ کا معاملہ ہے تو اس میں سٹہ بازی اور سود وغیرہ کی گنجائش نہیں ہوگی۔ نفع پر بھی کچھ حدود مقرر کی جانی چاہئیں اور اس بارے میں حکومت اپنی ذمہ داری ادا کرے تاکہ لوگوں کا استحصال نہ ہو سکے۔ سالانہ منافع (dividend) کا جہاں تک معاملہ ہے‘ اگر واقعتاً کمپنی قائم ہو جس کا کاروبار بھی حلال کا ہے تو اس کا منافع بھی حلال ہوگا۔ اس طور پر سرمایہ کاری اسلامی تعلیمات کے مطابق ممکن ہے۔

## تجاویز و ہدایات

آخر میں میں تین باتیں پیش خدمت ہیں:

(۱) سب سے پہلی بات ذاتی ذمہ داریوں کا معاملہ ہے۔ اسلام نے معیشت کی تعلیمات افراد اور معاشرے دونوں کے لیے دی ہیں۔ میں اپنی آمدنی کو حرام سے پاک کروں‘ اسلام نے جو باتیں حرام قرار دی ہیں ان سے اپنے آپ کو بچاؤں‘ یہ میری اولین ذمہ داری ہے۔

(۲) اجتماعی سطح پر جاری حرام کاموں کو ہم اکیلے ختم نہیں کر سکتے‘ اس کے لیے اسلامی نظامِ حکومت (نظامِ خلافت) کے قیام کی ضرورت ہے۔ تبھی ہر سطح پر اسلام کی تعلیمات کا نفاذ ہو سکے گا۔

(۳) یہ کام صرف خطبات اور تقاریر کے ذریعے نہیں ہو سکتا‘ یہ اجتماعی جدوجہد کا تقاضا کرتا ہے جو ہم سب کی ذمہ داری ہے۔

مری زندگی کا مقصد ترے دیں کی سرفرازی
میں اسی لیے مجاہد‘ میں اسی لیے نمازی!

چنانچہ ہمیں اقامتِ دین کی جدوجہد کو اپنی زندگی کا مقصد بنانا پڑے گا۔ اللہ ہمیں دین کی سربلندی اور اسلامی حکومت کے قیام کی سعی میں قبول فرمائے۔ آمین!

☆☆☆

# حاجی عبدالواحد صاحبؒ کی یادداشتیں (۱۳)

مرتب: پروفیسر حافظ قاسم رضوان

☆

## حضرت مولانا محمد یوسفؒ اور اباجی

## (مسلسل)

اواخر مارچ ۱۹۶۱ء میں حضرت جی مع رفقاء رائے ونڈ کے اجتماع پر تشریف لائے تو اباجی کی بھی حاضری ہوئی۔ بعد نمازِ فجر ۳۰ مارچ کے بیان کا نچوڑ یوں ہے: دنیا میں مادّے کی مختلف صورتیں ہیں مگر ان کی روح جو اس مادے کی خاصیت سے نفع دلواتی ہے' وہ صرف اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ مسلمان مادّے پر نظر نہیں رکھتا بلکہ اللہ تعالیٰ کی عطا پر نظر رکھتا ہے اور اسی سے مانگتا ہے۔ اس کا طریقہ سیکھنے کی جگہ مسجد ہے۔ توحید یہی ہے کہ اللہ پر نظر رکھے اور اس سے مانگنے کے لیے محمد مصطفیٰ ﷺ والی شکل اور زندگی بنائے۔ اس کے خلاف جانے سے توحید پر زد پڑتی ہے اور دعا اور نماز رد کر دی جاتی ہے۔ بازاری زندگی سے نکلنے کے لیے مجاہدہ ضروری ہے۔ علم' عبادت' اخلاق اور معاشرت کا سلسلہ قائم کرو۔ یہ تمہارا فرض ہے' نتیجہ اللہ تعالیٰ پر چھوڑ دو۔ اگر خالی (صرف) نماز پڑھنی آ جائے تو فرعون جیسی حکومت ٹوٹ سکتی ہے۔ آپ کو خدا سے مانگنے کے لیے مسجد دی ہے' جو مانگو گے وہ ملے گا۔ غیر کے آگے سوال یا شکوہ شکایت نہیں کرنی ہوگی۔ مصیبت اور بلا مانگو مت' اگر آ جائے تو استقبال کرو۔ اللہ راضی ہو رہا ہے' اپنی ضرورت پوری کر کے دوسروں پر لگا دو۔ یہ بلا (بغیر) دکان کی تجارت ہے۔ اللہ کا ماننا یہی ہے کہ اس کے خلاف نہ مانا جائے۔ جھوٹ' دھوکے' حرام اور غصب سے معاشرہ بگڑے گا اور دعا رد ہو جائے گی' نماز رد ہو جائے گی۔ مسجد بتاتی ہے کہ اللہ کے تابع ہو کر چیزوں میں لگو۔ شکلوں میں روح کی طاقت لینے کے لیے آؤ' ہر فرد اپنی علیحدہ زندگی بنا رہا ہے' حالانکہ سب کو جڑ کر



معاشرہ درست کرنا ہے۔ مسجد جڑنے کی جگہ ہے' (یہ سب کچھ) کرنا چاہو تو بڑا آسان ہے' نہ کرنا چاہو تو بڑا مشکل ہے۔

فجر کے بعد کی ہی حضرت جی کی ایک دوسری تقریر کا لُبِ لُباب کچھ اس طرح ہے: دنیا میں سارے انسان کامیاب ہونے کے لیے محنت کرتے ہیں۔ محنت کے دو راستے ہیں: ایک مادّی چیزوں والا جو نظر آتا ہے' یہ دھوکے کا ہے۔ اکثر لوگ اسی پر چلنا شروع کر دیتے ہیں۔ دوسرا راستہ خیر والا ہے' جو نظر نہیں آتا۔ اور اس پر چلنے میں شروع میں کچھ دقتیں ہیں۔ اسباب و وسائل والا راستہ تو جانوروں کو بھی نظر آتا ہے' مگر اس کے پیچھے جو حادثہ لگا آتا ہے' وہ ایک لحظہ سے پہلے بھی نظر نہیں آتا۔ زلزلہ' سیلاب یا آگ کا تب ہی پتہ چلتا ہے جب وہ واقع ہو جائے۔ فرعون اور قارون کو آخری ثانیے تک علم نہ ہو سکا۔ خیر والا راستہ نظر نہیں آتا' تا آنکہ کامیابی واقع ہو جائے' (جیسے) بدر اور بنی اسرائیل اور (حضرت) نوح علیہ السلام کی نجات۔ جو اللہ تعالیٰ کے وعدوں پر یقین کرتے ہوئے چلتے ہیں' انہیں یہ نصیب ہوتا ہے۔ (حضرت) موسیٰ علیہ السلام کو ماں نے (پانی میں) بہا دیا اور اللہ نے بچا لیا۔ اژدہا پر اللہ کے حکم سے ہاتھ ڈالا تو وہ لکڑی بن گیا۔ اللہ پر یقین کر کے اس کے حکم کے مطابق قدم اٹھاؤ تو سارے مادّی نقشے بدل جائیں گے۔ فراعنہ کی اساس زمین سے نکلی ہوئی چیزوں پر تھی۔ انبیاء علیہم السلام کی اساس اللہ کے حکم کی تعمیل اور اس کی قدرت سے مدد پر تھی۔ یہ اللہ کے در کے فقیر تھے' جن کے قدموں پر بادشاہوں کے سر تھے۔ چوبیس گھنٹے کی زندگی اسوۂ محمدیؐ پر لگاؤ گے تو یہ ساری احکام کی تعمیل بن جائے گی اور ہر کام پر اجر ملے گا۔ مسجد نبوی میں بارش میں کیچڑ ہو جاتا تھا' لیکن آج انہی کا نقشہ چل رہا ہے۔ نمرود ختم ہو گیا' ابراہیم علیہ السلام کا طریقہ جاری ہے۔ عزت' دولت' حکومت' صحت سب اللہ تعالیٰ دیتے ہیں۔ (حضرت) ابراہیم علیہ السلام نے ریت (ریگستان) میں خاندان آباد کیا' اللہ تعالیٰ وہیں رزق اور میوے دیتا ہے۔ مال اور حکومت پر بھروسہ کرنے والے مٹ جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ آخرت میں ہی نہیں' دنیا میں بھی دیتے ہیں۔ مادی چیزوں کا استعمال بھی انہی کے ہاتھوں میں ہے' انسان کے ہاتھ میں نہیں۔ چیزوں سے چیزیں ملنے کا طریقہ بازاری ہے۔ اس میں ظلم اور غصب آ جاتا ہے۔ احکام کی تعمیل میں چیزیں مخلوق پر لگاؤ تو خالق بے حساب دے گا۔ اللہ کا دروازہ سب کے لیے کھلا ہے۔ جو فرمانبرداری میں مجاہدہ کرے گا' انعام پائے گا۔ جو من مانی کرے گا' وہ محروم رہے گا۔ مسجد میں بار بار یاد دہانی کے لیے بلایا جاتا ہے۔ مسجد میں آ کر علم

سیکھو۔ احکام پر یقین اور چیزوں کی شکلوں پر سے نظر اٹھا لینے کو ہی ایمان کہتے ہیں۔ علم پر عمل کرو' سارا معاشرہ اللہ کے حکم کے مطابق ڈھال لو۔ اس عمل میں اخلاص سے زندگی بنے گی۔ تم لوگوں کی زندگیاں بناؤ ان کے پاس بیٹھ کر' اور اللہ اور رسول کی باتیں سناؤ' اللہ پاک تمہاری زندگی بنا دیں گے۔ آج لوگوں نے محض فوج کا پہلو سامنے رکھا ہے اور باقی سارے پہلو جن پر فوج بنی تھی' غائب کر دیے۔ مسجدیں آباد کرنے سے جو آوازیں عرش پر جاتی تھیں وہ اب بند ہو گئیں۔ مسجد کو پیسے والے کی ضرورت نہیں بلکہ پیسے والے کو بھی مسجد کی ضرورت ہے۔ مسجد میں مسلمانوں سے ملو' ان کی ضروریات کو پورا کرو۔ یہاں اللہ کی فوج تیار ہو گی' یہ فضا لے کر باہر نکلو۔ دین کی دعوت اور ترغیب میں جان اور مال لگاؤ۔

تیسرے دن کی حضرت جیؒ کی بعد از نماز فجر خطاب کا خلاصہ یوں ہے: زندگی گزارنے کے دو طریقے ہیں' ایک ساز و سامان والا' اپنی خواہشات کی پیروی میں ساری قوت لگا دو اور اپنی انفرادی یا خاندانی یا قومی یا ملکی زندگی سنوارو۔ اس کا نتیجہ آپس میں ٹکراؤ ہو گا اور انسان کی صفت ظلوم اور جہول کا اظہار ہو گا' ظلم اور غصب ہو گا۔ اور معاشرہ بگڑے گا تو حکومت بھی ظالم ہی ملے گی' اللہ کی مدد ظالم کو نہ ملے گی۔ دوسرا طریقہ تقویٰ کا ہے۔ اسباب سے نظر اٹھا کر اسباب میں تاثیر ڈالنے والے پر رکھو۔ یہ مشاہدہ کو چھوڑ کر غیب کے ساتھ جوڑنا ہے اور اندر باہر مجاہدہ اور محنت ہے۔ اللہ کے احکام کی تابعداری میں بھوک' پیاس' خاندان کی دشمنی' سفر اور افلاس برداشت کرنا ہے۔ ساری نسبتیں چھوڑ کر اللہ کی نسبت مقدم ہو' تب خلافت الٰہیہ قائم ہو۔ جو خدا کا بنے گا خدا اس پر اپنی قوت لگائے گا۔ اللہ کی صفت عدل پر ہے اور (عدل و) انصاف مسلم اور غیر مسلم سے اونچا ہے۔ خواہش کی لائن سے نکلنا اور احکام کی لائن (طریقہ) پر چلنا ہو گا۔ حاصل کو لاحاصل اور لاحاصل کو حاصل بنانا پڑے گا۔ بیوی بچوں سے اوپر والی زندگی پر قوت لگاؤ۔ اس سے عام محبت اور اخوت پیدا ہو گی جیسے سگے بھائی ہوں۔ یہی لوگ انصاف کریں گے' کوئی انہیں اپنی طرف نہیں مائل کر سکے گا۔ یہ محمدیؐ نسبت ہے۔ تقویٰ والے انسان دوسرے انسانوں اور حیوانوں کی محبت کا مرجع بنیں گے۔ یہ دوسروں کی زندگی بنانے کی کوششیں کریں گے اور سارا معاشرہ سدھر جائے گا۔ جتنی تکلیف اٹھائیں گے' اتنا ہی آگے بڑھیں گے' ابوبکر اور عمر (رضی اللہ عنہما)' بدر کا پہرہ' جہاد کا چندہ' تقویٰ والوں کے لیے محمد ﷺ والا انتظام کافی ہے۔ غیر متوقع جگہ سے مدد ملے گی۔ اپنے خرچ قابو میں رکھو تو دوسروں کی خدمت ہو سکے



گی۔ ہر ملک اور قوم میں دین کی دعوت اور ترغیب لے کر گھس جاؤ۔ لوگ مسجد میں کیوں نہیں آتے' بلاؤ اور سکھاؤ' اس سے نماز کا نقشہ قائم ہو گا' اجتماعی زندگی بنے گی۔ اس (ساری محنت) کے لیے وقت نکالو۔

رائے ونڈ کا اجتماع ختم ہونے پر حضرت جی مع رفقاء بلال پارک' لاہور تشریف لے آئے۔ بعد از نماز عصر حضرت جی کے ایک خطاب کا لُبِ لُباب یہ ہے: ہر فن کا اپنا علم ہے' جہاں آدمی کا علم ختم ہوتا ہے' وہاں خدا کا علم شروع ہوتا ہے۔ یہ علم انبیاءؑ لے کر آئے۔ چیزوں کا نفع جاننے کے لیے خدا کو جانو' جو نفع دیتا ہے۔ سلیمان علیہ السلام نے گھوڑے کاٹے' اللہ نے ہوا تابع کر دی۔ نمرود نے مال پر سکیم اٹھائی' فنا ہو گیا۔ ابراہیم علیہ السلام نے دعا پر سکیم اٹھائی' جواب تک چلتی ہے۔ محبوبیت سامانوں سے نہیں ملتی' خدا کے راستے میں ملتی ہے۔ ایوب علیہ السلام کی قربانی اور قبولیت۔ یوسف علیہ السلام کی محنت اور کامیابی۔ جس کا ہے' اسی کے طریقے پر چل' ورنہ نقصان ہو گا۔ صرف اللہ کا ذاتی ہے' باقی کسی کا کچھ بھی ذاتی نہیں۔ تم اللہ کے پابند بنو' وہ کسی کا پابند نہیں۔ نصاریٰ کا راستہ' کفارہ' مسلمانوں کا راستہ' تابعداری اور دعا۔ عملی (اسلامی) زندگی جذبات و خواہشات توڑ کر بنے گی (اس مرتبہ حضرت جی اپنے علاج کے سلسلہ میں کچھ زیادہ ٹھہرے)۔

دیگر مصروفیات کے ساتھ ۲۸ اپریل ۱۹۶۱ء کو حضرت جی نے نیلا گنبد مسجد میں جمعہ کے بعد خطاب کیا کہ چیزوں کی ظاہری صورتوں سے قطع نظر ان کی تاثیر اور ان کے فوائد اللہ کے اختیار میں ہیں۔ فرعون ظاہری سامان پر نظر رکھتا تھا۔ موسیٰ علیہ السلام کی نظر اللہ کی مدد پر تھی۔ جسے یہ مدد مل جائے' اس کا مقابلہ کوئی نہیں کر سکتا۔ یہ مدد اللہ کی اطاعت سے ملتی ہے۔ جائز و ناجائز طریقہ سے مادّی سامان کو فراہم کرنے میں نہ لگا رہے' بلکہ اللہ کے حکم کے مطابق انہیں اللہ کی مخلوق پر خرچ کرتا رہے۔ یہ سیکھنے کی چیز ہے۔ پہلے تو علم ضروری ہے' پھر اس پر یقین' جسے ایمان کہتے ہیں۔ پھر اس علم پر عمل اور اس عمل کے قبول ہونے کے لیے دعا۔ دعا عمل کو مقبول بناتی ہے اور عمل دعا کو مقبول بناتا ہے۔ مسجد اس تربیت کا مرکز ہے' عجز سے آئے اور مانگ کر لے جائے۔ مسجد کی فضا بازار میں لے جائے' نہ یہ کہ مسجد میں بھی بازار کی فضا لے کر آئے۔ لوگ اور سب کام بازار میں کرتے ہیں' صرف اس دین اور اس کی (عملی) تربیت کی دعوت نہیں دیتے۔ یہ کرنے کا کام ہے۔ اس کے لیے وقت دیں۔

اسی ڈائری میں ایک پرانے تبلیغی ساتھی کے بیان کا بھی ذکر ہے کہ انہوں نے کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّۃٍ کی آیت میں اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ کی تفسیریوں کی کہ یہ امت لوگوں کے لیے نکالی گئی ہے‘ ان کی رہنمائی اور ہدایت اور تبلیغ کے لیے۔ یہ تفسیر نبی کریم ﷺ نے مولانا محمد الیاسؒ کو رؤیا میں سمجھائی۔ فروری ۱۹۶۲ء میں ابا جی رمضان المبارک حضرت رائے پوریؒ کے ہاں گزارنے اور دیگر وقت بزرگوں کی خدمت میں حاضر ہونے کے لیے انڈیا روانہ ہوئے۔ اپریل میں حضرت جیؒ کے ہاں بستی نظام الدین میں ٹھہرنے کا موقع ملا۔ ۱۵ اپریل کی ایک خصوصی مجلس میں حضرت جی نے دنیا کی مادی اشیاء کی جسم کو ضرورت اور آدمی کی ان کے لیے جِدّوجُہد اور ان میں دلچسپی بیان کی اور فرمایا کہ ان میں روح کی ترقی کے لیے کچھ نہیں۔ روح کی ترقی تو محض اعمال سے ہوگی‘ جو اس دنیا میں نظر نہیں آتے۔ اور ان مادی اشیاء کے صحیح طور پر حاصل کرنے اور صحیح طور پر خرچ کرنے میں عمل میں آتے ہیں۔ اور اصول کی خاطر جو قربانی اور صدقہ اور محنت کی جائے گی‘ وہ روح کی ترقی کا باعث ہوگی۔ غصب اور ظلم چھوٹا ہو یا بڑا‘ وہ ایک ہی چیز ہے اور روح کی ہلاکت ہے۔ عدل جہاں بھی ہو اور جس حال میں بھی ہو‘ روح کی قوت اور مالک کی رضا کا باعث بنتا ہے۔

اگلے دن بعد از نمازِ فجر حضرت جیؒ کے ایک بیان کا خلاصہ کچھ اس طرح سے ہے کہ آپ نے الفاظ اور ان کے مفہوم کی مثال دے کر فرمایا کہ جس کے نوکر کا نام وزیر ہو‘ وہ کیا جانے اصلی وزیر کیا اور کون ہوتا ہے۔ اسی طرح نماز کا مفہوم تب معلوم ہو‘ جب اصلی نماز دیکھی اور سیکھی ہو۔ اور اسلام کا مفہوم تو یہی ہے کہ ہر کام اپنی نسبت کو چھوڑ کر اللہ کی نسبت سے کیا جائے۔ موسیٰ علیہ السلام نے اللہ کی نسبت سے کام کیا‘ فرعون نے ملک کی نسبت سے اور قارون نے مال کی نسبت سے۔ یوسف علیہ السلام نے جب اللہ کی نسبت اختیار کی تو آخر وہ ملک اور دولت حلال طریقہ سے ان کے قدموں میں آئی۔ ایوب علیہ السلام نے ایمان کی حرارت سے سو کوڑے مارنے کی قسم کھائی‘ اللہ کی رحمت جوش میں آئی اور ساری آزمائش دور کر دی۔ اللہ اس پر قادر ہیں کہ محنت کے بغیر مال‘ مال کے بغیر جنس اور جنس کے بغیر ضرورت پوری کر دیں۔ جو اللہ پر بھروسہ نہیں کرتا‘ اور اعمال کے ذریعے اس کی رضا حاصل کرنے کی بجائے مال کو حاجت براری کے لیے مقصد بنالیتا ہے‘ وہ نصرتِ الٰہی سے محروم رہتا ہے۔ کبھی اس کی (آہ و) زاری پر ترس کھا کر اس کی حاجت پوری بھی کر دی گئی‘ تو اس کا شمار تو مشرکوں میں رہے گا اور آخرت میں خسارہ ہوگا۔



حضرت جیؒ کی ایک اور گفتگو کا نچوڑ یوں تحریر ہے: ”عدل اور ظلم کا مضمون بیان ہوا۔ ناجائز جانبداری کسی کے حق میں بھی درست نہیں۔ جو کرے گا‘ وہ یقیناً نیچے گرایا جائے گا اور عدل جو بھی کرے گا‘ ضرور اوپر چڑھ جائے گا۔ مسلمانوں نے اسلام کا اس وقت غلط نمونہ پیدا کر رکھا ہے۔ اگر اس نے اپنی اصلاح نہ کی تو یہ نعمت کسی اور کو مل جائے گی۔“

شبِ جمعہ کے حضرت جی کے ایک بیان کی روداد کچھ اس طرح سے ہے: اپنی حاجتیں اشیاء میں پوری ہوتی دیکھ کر اپنی نسبت سے ان کے حصول کی کوشش کرنا۔ اور (اس کے برعکس) اپنی حاجتیں اللہ کے فضل سے پوری ہوتے دیکھ کر اس کی رضا اور مدد حاصل کرنے کے لیے اس کے احکام کی تعمیل میں اپنے اعمال درست کرنے کی کوشش کرنا۔ اللہ نے انسانوں کے ایک طبقہ کی حاجت دوسرے کا دین بنا دیا۔ سب ایک دوسرے کے کام آئیں‘ جس طرح انسان کا ہر عضو دوسرے کے کام آتا ہے۔ جب تک روح موجود ہے‘ یہ انتظام چلتا ہے۔ معاشرہ میں بھی جب تک جان ہے‘ اللہ کے احکام سے جڑا ہر طبقہ دوسرے کے کام آتا ہے۔

۱۳ اپریل بعد از فجر بیان کا لُبِّ لُباب کچھ اس طرح ہے: دنیا کی ساری مصیبت اشیاء کی محبت اور حصول کی کوشش اور آپس کے مقابلہ کی وجہ سے ہے‘ حالانکہ نہ محنت سے مال کا ملنا اور نہ مال سے مطلوبہ سامان کا ملنا اور نہ مطلوب سامان سے معلومہ حاجت کا پورا ہونا یقینی ہے۔ نمرود‘ فرعون‘ قارون‘ ابوجہل وغیرہ اس کوشش کے بڑے مظہر ہیں۔ باقی لوگ کسی نہ کسی درجہ اور پیمانہ پر وہی کام کرتے ہیں۔ اطاعت اور عبادت پر اللہ تعالیٰ کی نصرت حاصل کرنا نبیوں کا شیوہ ہے۔ اور یہ راستہ آج بھی کھلا ہے‘ دین اسی راستے کی دعوت دیتا ہے۔

مارچ ۱۹۶۳ء میں حضرت جی مع رفقاء رائے ونڈ کے سالانہ اجتماع میں تشریف لائے۔ ایک گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ مجاہدہ اس عمل کا نام ہے جو اللہ کی رضا کے لیے اسی کے بتائے ہوئے طریقہ پر کیا جائے۔ بعد از نماز فجر ایک بیان کا نچوڑ کچھ اس طرح ہے کہ مادّی اشیاء پر نظر رکھنے کی بجائے اللہ کی قوت پر نظر رکھنی چاہیے۔ یہی ایمان ہے۔ اللہ تعالیٰ ان مادّی اشیاء سے بے نیاز کر دیتا ہے۔ ورنہ یہی مادی اشیاء غالب ہو جاتی ہیں اور انسان کی ساری قوتیں اپنے اندر جذب کر لیتی ہیں۔

شام کی تقریر میں حضرت جی نے فرمایا: جو لوگ اللہ کی راہ میں کام کرتے ہیں‘ اگر یہ

دنیاوی کامیابی کے بعد دنیا اور اس کی حکومت اور تنعیم کی جانب متوجہ ہو جائیں' تو وہ کام انہی کے ہاتھوں برباد بھی ہو جاتا ہے۔ مادّی فوائد پر نظر ہو جانے سے اللہ کا نور جاتا رہتا ہے۔

۲۵ مارچ کی صبح کے حضرت جی کے خطاب کا خلاصہ یوں ہے کہ دنیا کی نعمتیں ختم ہو جاتی ہیں مگر عقبیٰ کی نعمتیں ختم نہیں ہوں گی۔ جو وقت صرف ان (دنیا کی نعمتوں) میں لگا' وہ ضائع ہو گیا اور جو محنت عقبیٰ کے لیے کی' وہ ضائع نہیں ہو گی۔ کیونکہ مادہ پر محنت سے مادہ تو ملے گا' مگر اسے بقا نہیں' اور عمل پر محنت سے اللہ کی رضا ملے گی اور پھر مادہ کی بھی کوئی کمی نہ رہے گی۔ ہاں انسان اسے مقصد نہ بنائے' ورنہ پھر وہی خطرناک نتائج سامنے آ جائیں گے اور مادہ کی محبت کی وجہ سے آپس میں جنگ و جدال اور پھوٹ پڑ جائے گی۔

ایک دوسرے موقع پر حضرت جی نے چار آداب بیان کیے: نہ سوال' نہ اشراف' نہ بے اجازت کسی چیز کا استعمال اور نہ ہی اسراف۔ یہ چار باتیں تبلیغی سفروں میں مدنظر رکھنی چاہئیں۔ اسی طرح تین درجے عمل کے ہیں: خود عمل' دوسرے کو عمل کی ترغیب اور دوسرے کو عمل کی ترغیب دینے والا بنانا۔ ان (مراحل) پر تدریج سے گزارا جائے۔ رائے ونڈ سے واپسی پر بلال پارک' لاہور میں حضرت مولانا محمد یوسف کا ایک بیان ہوا جس میں آپ نے نماز کی قیمت اور قوت بتائی: نماز کے اہتمام سے اللہ کا نور نصیب ہوتا ہے جو نیک اعمال کی وقعت اور ان کا فیض دکھلاتا ہے' اور پھر انسان ان پر عمل پیرا ہو کر اللہ کو راضی کرتا ہے تو دنیا سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ جمعہ کا بیان حضرت جی کا مسجد شیرانوالہ دروازہ میں ہوا: جس طرح سورج کی روشنی میں اردگرد کی مادی اشیاء نظر آتی ہیں' ان کے خواص کا پتہ چلتا ہے اور ان سے نفع اٹھایا جاتا ہے' اسی طرح اللہ کے نور سے اعمال کے خواص کا پتہ چلتا ہے اور ان کی پیروی سے روحانی فائدہ اور اللہ کی رضا ملتی ہے۔ جیسے اندھیرے میں پتھر' سونا اور روٹی برابر ہیں' اسی طرح جہالت' عدل اور ظلم' امانت اور خیانت' عبادت اور بغاوت میں تمیز نہیں کر سکتی' مادّی نفع عارضی ہے اور روحانی نفع دائمی' اور مادی کامیابی اس کے جلو میں آتی ہے۔ نماز جمعہ مولانا عبید اللہ انور خلف الرشید مولانا احمد علی لاہوریؒ نے پڑھائی۔

اس کے بعد حضرت جی تبلیغی اسفار کے لیے مختلف شہروں سے ہوتے ہوئے اواخر اپریل میں دوبارہ لاہور آئے۔ بلال پارک میں صبح آپ کا بیان ہوا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قربانی'



ہاجرہ اور اسماعیل علیہما السلام کا صبر۔ پھر اس قربانی پر اجر' دنیا میں موسویؑ' عیسویؑ اور محمدیؐ امتیں ہیں۔ بعد میں ایک صاحب نے ناشتہ کی مجلس میں نماز پر زور کی وجہ پوچھی' حالانکہ معاملات پر بھی زور ویسا ہی ضروری ہے۔ حضرت جی نے فرمایا کہ صحیح طور پر ادا کی ہوئی نماز ہی معاملات میں درستی کا باعث بنتی ہے۔ ایک دوسری تقریر کا نچوڑ یوں ہے کہ کمائی اور خرچ پر نظر رکھنی چاہیے۔ وہ خرچ جو شریعت کے مطابق ہو' بجائے خود ایک کمائی ہے۔ یوں توجہ (کرنے) سے ساری آمد اور سارا خرچ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کمائی بن سکتا ہے۔ ایک خصوصی مجلس میں حضرت جی کا خطاب ہوا۔ کامیابی اور ناکامی کا معیار دولت سمیٹنا اور راحت کا حصول نہیں' بلکہ اللہ کی رضا اور عاقبت کی بہبودی ہے۔ عوام سے ملنا' مسجد کی حاضری' لوگوں کے کام آنا' خدمت (کرنے) کا موقع بھی خدمت لینے کا موقع ہی نہ بن جائے۔

۲۸ اپریل کی ایک دوسری خصوصی مجلس میں حضرت جی نے فرمایا: آمد اور خرچ پر پہرہ ہونا چاہیے۔ وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ' کا یہی مطلب ہے کہ ناجائز آمدن سے صبر کیا جائے اور قرآن کی تعلیم پر عمل کیا جائے۔ حرام سے روک اور فرض کی تکمیل' نفع کا معیار' مادہ نہ ہو بلکہ روح ہو۔ یکم مئی کی تقریر میں حضرت جیؒ نے تبلیغی جماعت کا لائحہ عمل سمجھایا۔ مقامی کام' ہفتہ وار گشت' مہینہ میں تین دن' سال بھر میں چلہ' بیرونی ممالک میں دعوت۔ وہاں سے آمدہ جماعتوں کی نصرت۔ یہ سب سیڑھی کے زینے ہیں۔ جو سب پر عمل پیرا ہو گا' وہی چھت پر پہنچے گا۔ یا جماعت کی صفیں ہیں' پہلی صفیں نہ ہوں تو امام سے ربط نہ رہے گا۔ چند کی قربانیاں بھی باقیوں کے اعمال کی قبولیت کا باعث بنیں گی۔ مستقل قیام مسجد میں چاہیے۔ جس کام کو گھر یا باہر گئے' فراغت کے بعد پھر واپس آ گئے۔ چھ نکات کے ساتھ اطاعتِ امیر..... ابنِ ملجم آخر تک ذکر کرتا رہا اور زبان کٹنے پر گھبرایا' مگر امیر سے بغاوت اور خود پسندی اور خود رائی نے اس (گمراہی کی) منزل تک پہنچایا۔ نئے آنے والوں کا کہا ماننا اور پرانوں کا بچھ جانا اور بچھے رہنا' گو مداہنت نہ ہو' مگر ہر دم دوسروں پر تنقید بھی نہ ہو۔ عیب جوئی تو بھگا دیتی ہے' خود نمونہ بننا چاہیے۔ ۳۰ جون ۱۹۶۴ء کو حضرت جی مع شیخ الحدیث' مولانا انعام الحسن و دیگر رفقاء پاکستان (فیصل آباد) تشریف لائے۔ اکابرین کے قیام کے دوران ابا جی کا بھی وہاں جانا ہوا۔

ایک خطاب میں حضرت جیؒ نے فرمایا: ''دنیا کے اسباب سے کام لینے سے مقدم اپنی

اصلاح ہے اور اسی کا امتحان ہے۔ اور اپنی اصلاح کے لیے (تبلیغ میں) نکلنے کی دعوت دی۔

۱۴ جولائی کو بلال پارک کے ایک بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ کی ذات دعوت دینے والے کے ساتھ ہوتی ہے' چاہے باقی ساری کائنات اور کل اسباب مخالف ہوں' نمرود اور فرعون کی تباہی۔ اللہ تعالیٰ ہر چیز کو بدلنے پر قادر ہے' آگ کو گلزار اور سمندر کو خشکی بنا سکتے ہیں۔

(۱۹۶۵ء کا روزنامچہ اباجی کی یادداشتوں میں دستیاب نہیں ہوا۔)

مئی ۱۹۶۷ء میں اباجی اور امی جی بذریعہ بحری جہاز فریضہ حج کی ادائیگی کے لیے جا رہے تھے۔ راستے میں ایک ساتھی سے تبلیغی جماعت کے بارے میں گفتگو کا ذکر ہے کہ گشت سے واپس جا کر لوگ پہلی زندگی میں ہی غرق ہو جاتے ہیں اور اپنے عملی پہلو میں کوئی دینداری یا شریعت کی پابندی نہیں دکھلاتے۔ اور لوگ اس پر ناامید ہونے لگتے ہیں کہ تبلیغی گشت بھی آدمی کو دین پر عامل نہیں بنا سکتے' تو آخر ان کا فائدہ کیا ہے؟ ان سے عرض کیا گیا کہ ایسے استثناء تو ہر معاشرہ اور ہر طبقہ میں مل جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ خود نبی کریم ﷺ کی اپنی مجلس میں بعض منافقین موجود تھے۔ مگر ہم ان چند افراد پر نہیں بلکہ اسلام کی تعلیم پر اپنے اندازے کا انحصار رکھتے ہیں۔ مارچ ۱۹۶۸ء میں ادائیگی حج کے بعد اباجی حسبِ معمول مکی مسجد' کراچی (تبلیغی جماعت کا مرکز) میں تبلیغی کام میں شامل ہوئے اور واپسی پر سکھر کے تبلیغی اجتماع میں بھی بھرپور شرکت کی۔ اس طرح اکتوبر میں حسب دستور رائے ونڈ کے سالانہ تبلیغی اجتماع میں بھی شمولیت رہی۔

اکتوبر ۱۹۶۹ء میں بھی اباجی نے حسب معمول رائے ونڈ کے سالانہ تبلیغی اجتماع میں شرکت کی اور اوائل نومبر میں اباجی مع رفقاء حضرت مولانا انعام الحسن (امیر تبلیغی جماعت) اور ساتھیوں کے ہمراہ ڈومالا (نارووال) اور للیانی (قصور) کے تبلیغی اجتماعات میں شریک ہوئے۔ بعد میں گنڈاسنگھ والا سرحد سے ساتھیوں کے ہمراہ حضرت مولانا انعام الحسن' مولانا محمد ہارون (صاحبزادہ حضرت جیؒ) اور مولانا محمد عمر پالن پوری کو ہندوستان روانہ کیا۔

رمضان المبارک ۱۹۷۲ء کے آخری عشرے کی ایک افطاری کی دعوت میں اباجی نے دوستوں کو حضرت جی مولانا محمد یوسفؒ کے ایک بیان کا ملخص سنایا کہ عبادات سکھلائی کے درجہ میں ہیں۔ اصلی مقصد جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی فوج تیار کی ہے' وہ (دوسری) اقوام کے لیے اسلام کا صحیح معاشرہ اور معاملات کا درست نمونہ پیش کرنا ہے۔



۱۹۷۴ء کے روزنامچے میں اباجی کے ایک دوست کے ساتھ تبلیغی جماعت کے حوالے سے ایک تلخ اور مایوسانہ گفتگو کا ذکر ہے: ''تبلیغی جماعت کے بعض اکابرین کی عاجز سے دوری پر بات چل نکلی۔ لاہور میں ایک ملازم پیشہ دھڑے نے جماعت پر قبضہ جما رکھا ہے۔ گشتوں میں تعلیم اور مقامی کام کو بالکل چھوڑ کر اس نہایت کامیاب تحریک کی جان نکال چکے ہیں اور اب کندھوں پر بستر اٹھائے تبلیغ کرتے پھرتے ہیں۔ کچھ تعریف تو ہو جاتی ہے مگر جیسے اپنا ماحول ساتھ لیے ہوئے جاتے ہیں' ویسے ہی بے اثر اور بے نتیجہ واپس آ جاتے ہیں''۔ آخر میں اباجی نے اپنے پرانے تبلیغی دوست کو تبلیغ میں جڑے ہوئے ہی تعلیم اور مقامی کام پر خصوصی توجہ دینے کے لیے کہا۔ تبلیغی جماعت سے اباجی کا ایک بڑا شکوہ نہی عن المنکر پر بالکلیہ توجہ نہ دینے کا تھا' جس کا اکثر و بیشتر دوستوں سے ذکر ہوتا رہتا۔ اسی حوالے سے اباجی نے بابو محمد بشیر (امیر تبلیغی جماعت' پاکستان) کو بھی بعض مشترکہ دوستوں کے ذریعے پیغام بھجوایا۔ رمضان المبارک ۱۹۷۴ء کے آخری عشرہ میں اباجی حسبِ معمول مدنی مسجد' گڑھی شاہو میں مع رفیق اعتکاف میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک دن اچانک بابو محمد بشیر اباجی کی ملاقات کے لیے پہنچ گئے۔ بقول اباجی تبلیغ میں نہی عن المنکر کا مقام سورۂ ہود سے بیان کیا۔ اپنا اجنالہ (امرتسر) کا تجربہ اور مولانا محمد یوسفؒ کا بیان بھی سنایا' دعا بھی کی۔ (جس کام اور دعوت سے بندے کا جتنا زیادہ جذباتی تعلق ہوتا ہے' اس سے پھر اتنا ہی جذباتی شکوہ بھی ہوتا ہے' راقم)

مارچ ۱۹۷۶ء میں اباجی کے پرانے میواتی دوست میاں جی عبداللہ' جنہوں نے اپنی ذاتی اراضی تبلیغی مرکز' رائے ونڈ کے لیے وقف کی تھی' ایک ساتھی کے ہمراہ اباجی کی ملاقات کو آئے۔ میاں جی سے تبلیغی جماعت کے تیس سالہ اتار چڑھاؤ خصوصاً پاکستان' لاہور اور رائے ونڈ میں اس کی بدلتی ہوئی حالت پر سیر حاصل گفتگو ہوئی۔ جماعتوں کی تعداد اور شان بڑھ گئی مگر وہ روح اور خلوص گھٹ گیا' جس سے معاشرہ میں اصلاح ہونی رک گئی۔ اللہ ہی وہ عزم اور ایثار' وہ محنت اور قربانی پھر عطا فرمائے' آمین۔ (اپنی بھرپور جوانی' صلاحیتیں اور محنتیں اباجی نے تبلیغی جماعت کے ساتھ لگائی تھیں۔ اس لیے اس کے بارے میں اباجی بہت جذباتی اور متفکّر رہتے تھے اور اس کے کمزور اور اصلاح طلب پہلوؤں کے بارے میں ہمیشہ اخلاص سے متعلقہ احباب کو توجہ دلاتے رہتے تھے' تاکہ وہ اس کی اصلاح کے لیے مقدور بھر کوششیں کر

سکیں۔ یہی 'دردِ دل' تھا جس کی بنا پر لہجے میں بھی تلخی اور مایوسی آ گئی تھی۔ البتہ دلی خواہش اباجی کی یہی تھی کہ یہ جماعت ایک کامل نمونے والی دعوت وتبلیغ والی جماعت بن جائے۔ راقم)

پرانے دوست مولانا سعید احمد خاں (امیر تبلیغی جماعت' سعودی عرب) مع رفقاء اپریل ۱۹۷۶ء میں ملنے آئے تو اباجی کا زخم جگر پھر ہرا ہو گیا۔ ''تبلیغی جماعت میں عمل کا جو فرق پڑ رہا ہے' اس سے آگاہ کیا۔ جو باہر کے لیے نکلے' اسے کسی حرکت پر بھی کچھ نہیں کہنا' نہ اس کے متعلق کچھ سننا ہے۔ تعداد تو بڑھ رہی ہے مگر اثر بالکل زائل ہو رہا ہے۔ مولانا نے غور سے سنا اور توجہ دینے کے متعلق کہا۔ موقع ملا تو بات کریں گے۔''

اواخر اکتوبر میں اباجی مع ساتھی رائے ونڈ کے سالانہ تبلیغی اجتماع میں شریک ہوئے۔ وہاں مولانا عبیداللہ بلیاوی (رفیق دیرینہ) کا بھی بیان سنا اور ان سے ملاقات بھی کی اور لبوں پر پھر وہی شکوہ آ گیا۔ ''تبلیغی جماعت کے اتنے شاندار ظاہر کے باوجود معاشرہ کی اصلاح میں اس کا قطعی کوئی اثر نہ ہونے کی کیفیت بیان کی۔ یہ ساری محنت اور وقت اور خرچ کیوں بے کار جا رہا ہے' اس کی تحقیق اور مداوا ہونا چاہیے۔''

اگست ۱۹۷۷ء میں اباجی کے عقیدت مند اور پرانے تبلیغی کارکن محمد حسین آزاد حسب معمول اباجی سے ملاقات کے لیے آئے۔ ''دورانِ گفتگو تبلیغی جماعت کا ذکر آیا۔ اس میں اب تک بعض نہایت مخلص کارکن موجود ہیں مگر اس کی ہائی کمان کا طرز مولانا محمد الیاسؒ کے طریقہ کار سے بہت مختلف ہو چکا ہے۔ وہ تو سنت نبی پاک ﷺ کی پیروی میں محبت اور حکمت سے بلاتے تھے' یہ لوگ حکومت کی لائن سے اپنی مرضی چلاتے اور پیچھے دھکیلتے ہیں۔''

اکتوبر ۱۹۷۷ء میں اباجی رائے ونڈ کے اجتماع میں یکے بعد دیگرے دو رفیقوں کے ہمراہ شریک ہوئے۔ ایک چکّر ڈاکٹر اسرار احمد کے ساتھ لگا اور حضرت شیخ الحدیثؒ سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ دوسرے دن مولانا عبیداللہ انورؒ مع رفقاء کے ساتھ رائے ونڈ گئے اور دعا میں شامل ہوئے۔ (ان کا تفصیلی ذکر اپنے مقام پر آئے گا' راقم) مئی ۱۹۸۱ء میں اباجی کے روزنامچے میں صوفی محمد اقبال (خلیفہ حضرت شیخ الحدیث) کے ایک خط کا ذکر ملتا ہے جس میں انہوں نے تبلیغی جماعت کی موجودہ حالت پر تبصرہ' خامیوں پر تنقید کی ہے۔ اور بہتری احوال کے لیے گزارشات کی گئی ہیں۔ نومبر ۱۹۸۲ء میں اباجی بوجہ کمزوریٔ صحت کچھ سالوں کے بعد



ایک ارادت مند کے ساتھ گاڑی میں روانہ ہو کر (غالباً آخری بار) رائے ونڈ کے سالانہ اجتماع میں شریک ہوئے۔ مولانا سعید احمد خاں سے بھی ملاقات ہوئی اور پرانے تبلیغی دوستوں نے مولانا انعام الحسن سے بھی ملا دیا۔ حضرت جی بڑی شفقت سے ملے اور دعا دی۔ (مجھ پر یہ اللہ کا خاص فضل ہے کہ اباجی کے ہمراہ حضرت جی سے بھی بارہا مصافحہ' سر پر دست شفقت' دعا اور ساتھ بیٹھ کر کھانے اور تبرک حاصل کرنے کا موقع ملا۔ ہو سکتا ہے کہ بزرگوں کی یہ دعائیں ہی بخشش کا ذریعہ بن جائیں۔ راقم)

اب حضرت جیؒ کے اقوالِ زریں کا ایک مختصر گلدستہ پیش خدمت ہے:

☆ تبلیغ کا مقصد کسی خاص چیز کی اشاعت نہیں بلکہ اس کے ذریعے ہمیں اس چیز کو زندہ کرنا ہے جس کو حضور اکرم ﷺ ہم مسلمانوں کی فلاح کے لیے لے کر آئے۔

☆ حالات کی بنیاد ملک و مال' زر و زمین' راکٹ وغیرہ پر نہیں ہے' بلکہ حالات کی بنیاد اعمال ہیں۔ انبیاء' صحابہ اور علماء والے اعمال حالات سنوارنے والے بنیں گے۔

☆ اگر آج ہمارے فیصلے خدا کی مرضی کے مطابق ہو جائیں' نبیوں والے طریقوں پر آ جائیں تو بات بن گئی۔ اے مسلمانو! اپنے طریقوں کو بدلو۔

☆ ولایت کی دو قسمیں ہیں: ایک یہ کہ سب کچھ چھوڑ کر جنگلوں میں نکل جانا' تزکیہ اختیار کرنا اور اللہ کی طرف چلنا۔ یہ ولایت کا ادنیٰ درجہ ہے۔ اور دوسرا ولایت کا اعلیٰ درجہ ہے کہ جس شعبے میں چل رہے ہیں' اس کو ولایت والوں کی صفات سے چلایا جائے۔ اس کے لیے اپنے اپنے شعبوں سے نکل کر اپنا یقین' عبادت اور اخلاق بنانے کی ضرورت ہے' ان چیزوں کو بنا کر پھر شعبوں میں لگایا جائے۔

☆ کاش دنیا کا کوئی ایسا خطہ مل جاتا جہاں اسلام اپنے صحیح خدوخال کے ساتھ نظر آتا۔

☆ آج ہر طبقہ میں جو ہر جگہ جوتا چل رہا ہے اور مسائل بگڑتے جا رہے ہیں اس کا علاج صرف حضرت محمد ﷺ کے طریقے میں ہے' جو جتنا کرے گا اللہ کی طرف سے اتنا پائے گا۔

☆ عمل اخلاص کے بغیر مردہ تو ہے ہی' اور دیکھو! گھروں' بازاروں' دفتروں' یہاں تک کہ مدارس و مساجد میں ایسے مرداروں کے ڈھیر لگ رہے ہیں۔

☆ اللہ کی رضا کے علاوہ کسی بھی نیت سے عمل کرنا نفسانیت ہے۔

☆ سب سے پہلے کام یہ ہے کہ اپنے مزاج کو اسلام کے مطابق بنالیا جائے‘ اور یہ جب بنے گا جب اس بات کا یقین پیدا ہو جائے کہ کسی مخلوق سے کچھ نہیں ہوتا‘ سب اللہ سے ہوتا ہے۔ کامیابی اور ناکامی انسان کے اندر کے حال کا نام ہے‘ باہر کی چیزوں کے نقشے کا نام کامیابی اور ناکامی نہیں ہے۔ صرف کلمہ اور تسبیح سے امت نہیں بنے گی۔ امت میل ملاپ اور معاشرت کی اصلاح سے اور سب کا حق ادا کرنے اور سب کا اکرام کرنے سے بنے گی‘ بلکہ تب بنے گی جب دوسروں کے لیے اپنا حق‘ اپنا مفاد قربان کیا جائے گا۔

☆ امت کے بنانے اور بگاڑنے میں‘ جوڑنے اور توڑنے میں سب سے زیادہ دخل زبان کا ہوتا ہے۔ یہ زبان دلوں کو جوڑتی بھی ہے اور پھاڑتی بھی ہے‘ اس لیے سب سے زیادہ ضرورت ہے کہ زبانوں پر قابو ہو۔

☆ اسلام جب بھی چمکا ہے‘ قربانیوں سے چمکا ہے‘ آج بھی قربانیوں سے ہی چمکے گا۔ اسلام کے لیے قربانیاں ہوں تو یہ دشمنوں کے گھیرے میں بھی چمکتا ہے۔ اور جب قربانیاں نہ ہوں تو اپنی بادشاہت میں بھی مٹ جاتا ہے۔

☆ دیکھئے خوب سمجھ لیجیے‘ ہم اکابر علماء کے ہر وقت محتاج ہیں‘ ان کے بغیر چارہ نہیں‘ ان کے دامن کے ساتھ وابستگی ہمارے لیے سعادت ہے۔

☆ اس وقت کے بگاڑ کی وجہ صرف یہ ہے کہ ہم سب جو اللہ پاک کے حکموں پر جان کھپانے والے ہوتے‘ وہ مخلوق پر جان کھپانے اور اسی سے لینے کے غلط تصور کے عادی ہو گئے۔

☆ یہ (دعوت و تبلیغ) انبیاء کا خاص الخاص عمل تھا۔ انبیاء والی مدد یں اسی عمل کے ساتھ ہیں‘ بشرطیکہ یہ عمل حضور ﷺ کے طریقے پر ہو۔

☆ خالی نقل و حرکت اور لوگوں کے اٹھنے اور ملکوں میں نکل جانے کا نام (تبلیغی) کام نہیں ہے۔ اصل تو یہ ہے کہ خود کام کرنے والوں کے قلوب میں اللہ ربّ العزت کا یقین ترقی کر رہا ہو اور غیر اللہ کی نفرت پیدا ہو رہی ہو اور حضور ﷺ کی اتباع کا ذوق ابھر رہا ہو۔

☆ اس راستے پر چلنے کے لیے خارجی نہیں بلکہ داخلی دولتیں چاہئیں۔ خدا کا یقین ہو‘ خدا کا دھیان ہو‘ خدا کا خوف ہو‘ (حضرت) محمد ﷺ کے طریقے پر خدا کے خزانوں سے ملنے کا



اور نعمتوں کے دروازے کھلنے کا یقین ہو۔

☆ علم و ذکر اس کام کے دو بازو ہیں۔ ان میں سے کسی ایک کی کمی اور سستی اصل کام کے لیے سخت مضر اور کمزور کرنے والی ہے۔ ہر ایک اپنی جگہ نہایت ضروری لابدی ہے‘ علم و ذکر کے مراکز خانقاہیں اور مدارس ہیں۔ ہم اپنے ان دونوں بازوؤں کو قوی کرنے کے لیے ہر طرح سے ہر وقت اہلِ علم‘ علماء‘ صلحاء اور مشائخ کے محتاج ہیں۔ وہ ہمارے بالخصوص‘ ان دونوں اہم امور میں مقتداء ہیں۔

☆ کام کا فائدہ ہمیشہ اس کے اصولوں کے ساتھ کرنے سے ہوتا ہے۔ اصولوں کی بے عنوانی کا فساد اس کی اصلاح کو داب لیتا ہے اور اس کے خیر سے منتفع نہیں ہونے دیتا۔

☆ عورتوں کی تبلیغ میں صرف یہ کیا جائے کہ عورتیں دینی کتب پڑھیں‘ پڑھائیں‘ سنائیں‘ اسلامی رواج کی پوری پابندی کریں اور اپنے متعلقین کو بھی اس کا پابند کریں۔ اپنے مَردوں کو دین سیکھنے کے لیے تبلیغ کے لیے اندر باہر بھیجیں‘ تاکہ جو کچھ سیکھ کر آئیں‘ وہ ان کو سکھائیں۔ گشت کی قطعاً اجازت نہ دی جائے۔ (اس حوالے سے آج کل جماعت میں اس کے برعکس ہو رہا ہے‘ راقم)

☆ گشت کا عمل اس کام میں ریڑھ کی ہڈی کی سی اہمیت رکھتا ہے۔ اگر یہ عمل صحیح ہوگا تو قبول ہوگا‘ دعوت قبول ہوگی‘ دعا قبول ہوگی‘ ہدایت آئے گی۔

☆ (تبلیغی کام میں) اصول کی پابندی کا بہت ہی زیادہ لحاظ رکھا جائے۔ علم‘ ذکر‘ خدمت‘ اکرامِ مسلم‘ تبلیغ‘ دعا وغیرہ میں سب کو مشغول رکھتے ہوئے لایعنی سے پرہیز کا اہتمام کیا جائے‘ راتوں میں رونے کو بہت بڑھایا جائے‘ بالخصوص اکرامِ مسلم کے نمبر کی خوب وضاحت کرتے ہوئے عمل کیا جائے اور کرایا جائے۔

جلا سکتی ہے شمعِ کشتہ کو موجِ نفس ان کی
الٰہی کیا چھپا ہوتا ہے اہلِ دل کے سینوں میں!
تمنا دردِ دل کی ہو تو کر خدمت فقیروں کی
نہیں ملتا یہ گوہر بادشاہوں کے خزینوں میں!

❁❁❁

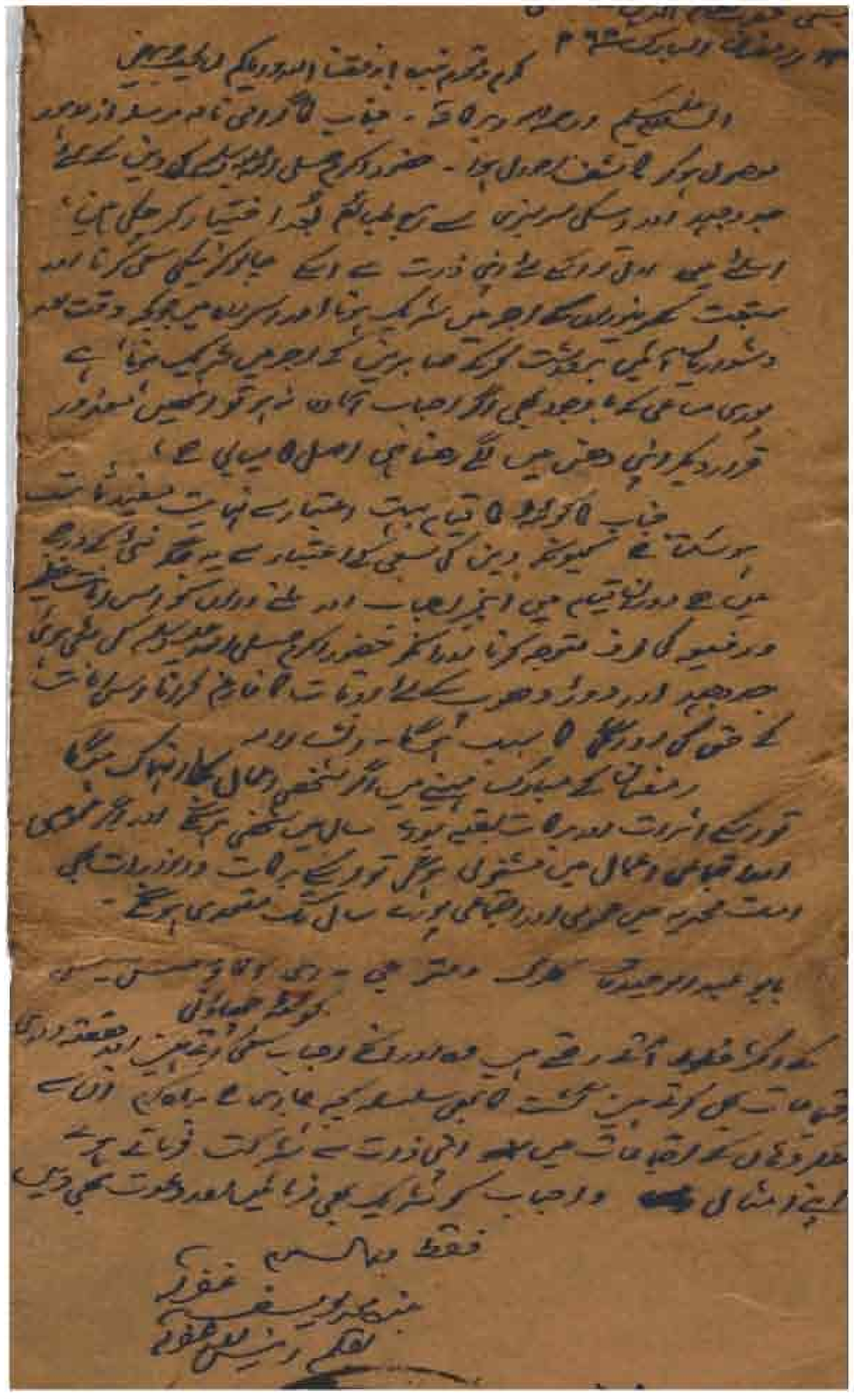

حاجی عبدالواحد صاحبؒ کے نام حضرت مولانا یوسفؒ کا ایک مکتوب

May 2017
Vol.66

Regd. CPL No.115
No.5

Monthly Meesaq Lahore

امام یحییٰ بن شرف الدّین النّوویؒ کے مجموعۂ احادیث

اربعینِ نووی رحمۃ اللہ علیہ

کی تشریح و توضیح پر مشتمل

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

کے خطاباتِ جمعہ

❁ دیدہ زیب ٹائٹل ❁ امپورٹڈ بک پیپر ❁ معیاری طباعت

❁ 852 صفحات ❁ دو حصوں پر مشتمل ضخیم کتاب

❁ قیمت 600 روپے

خود پڑھیے ..... احباب
کو تحفہ میں دیجیے!

مکتبہ خدام القرآن لاہور

36۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور فون: 3-35869501

email: maktaba@tanzeem.org website: www.tanzeem.org